تعلیم و تربیت
نومبر 2006ء
عید مبارک
صوفی نیاز مند کے مہمان
سوال
انتقام

عید میلہ

عید ہے اور عید کے تہوار میں
ہو رہی ہے ہاؤ ہو بازار میں

عید میلہ لگ رہا ہے ہر طرف
ہر کوئی مصروف کاروبار میں

شاہی مسجد، شاہی قلعہ، چڑیا گھر
بھیڑ ہے لوگوں کی شالامار میں

موج میں ہیں شہر کے چھوٹے بڑے
سیر کرتے پھر رہے ہیں کار میں

بانٹتے ہیں عید کے تحفے ہمیں
شہر کے ہر مفلس و نادار میں

میرے بچو یاد رکھنا ہے اُنھیں
وہ جو ہیں مشکل میں اور آزار میں

مفلس: غریب
آزار: تکلیف

چار سالہ چاند میاں نے دادو کے کمرے میں جھانکا۔ انہیں دادو سے کام تھا مگر وہ کمرے میں نہیں تھیں۔ ابھی وہ واپس پلٹنے کو تھے کہ اچانک ان کی نظر دادو کے ٹرنک پر پڑی۔ ارے ..... ان کی باچھیں کھل گئیں۔ آج دادو کے ٹرنک پر تالا نہیں تھا۔ اصل میں دادو اپنے اس بڑے سے ٹرنک میں گاجر کا حلوہ، سیب کا مربہ اور کھوئے کی برفی جیسی سوغاتیں چھپا کر رکھتی تھیں اور چاند میاں کو یہ ساری چیزیں ہی بہت پسند تھیں۔ مگر دادو کبھی انہیں حصے سے زیادہ نہیں دیتی تھیں۔ کھوئے کی برفی یا گاجر کا ڈھیر سارا خشک حلوہ تقریباً ہر ماہ ہی بنتا تھا۔ لیکن سب کو ان کا حصہ دینے کے بعد دادو باقی کا سارا حلوہ ایک بڑے سے ایئر ٹائٹ جار میں بند کر دیتیں اور اسے ٹرنک میں رکھ کر تالا ڈال دیتیں۔ وجہ یہ تھی کہ دادو کے کمرے میں کوئی الماری نہیں تھی۔ اور وہ پرانے زمانے کی عورت تھیں۔ انہیں الماری کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ عمرو عیار کی زنبیل کی طرح وہ ہر کام کے لئے اپنا ٹرنک ہی استعمال کر لیتی تھیں۔ دادو کے رکھے ہوئے یہ حلوے اور مٹھائیاں مہمانوں کی آمد پر یا کسی وقت چائے یا ناشتے پر بڑے قرینے سے استعمال ہوتے تھے۔ چاند میاں جو اس گھر کے پہلے پہلے اور بے حد لاڈلے پوتے تھے، ان سے دادو بھی کچھ نہ چھپاتی تھیں۔ لیکن وہ بھی تو ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد اپنا فرمائشی پروگرام لے کر پہنچ جاتے تھے پھر دادو کیا کرتیں۔

تو اس وقت سنہری موقع تھا چاند میاں کے لئے کہ دادو بھی نہیں تھیں اور جان کا دشمن تالا بھی کھلا ہوا تھا۔ میز پر چڑھ کر انہوں نے بمشکل تمام ٹرنک کا بھاری ڈھکنا اٹھایا۔ سامنے ہی حلوے کا منہ بند جار رکھا تھا۔ انہوں نے جھک کر جار پکڑنا چاہا۔ مگر وہ کافی نیچے تھا۔ وہ جھکے، اور جھکے اور ..... اور جھکے اور غڑاپ سے ٹرنک کے اندر۔ اور اسی وقت ایک اور حادثہ ہوا کہ ایک پُرشور آواز کے ساتھ ٹرنک کا ڈھکنا نیچے آ گرا۔ وہ تو شکر ہوا کہ ٹرنک کے کنڈے بیچ میں آ پھنسے تھے ورنہ شاید دم گھٹ کر رہ جاتا۔ چاند میاں نے حسبِ معمول بڑا سا منہ کھول کر رونا چاہا۔ مگر اسی وقت کہیں دور سے دادو کی آواز آئی۔ "ارے شبانہ دیکھیو تو ..... کہیں کچھ گرا ہے۔" شاید دادو ٹی وی لاؤنج میں تھیں۔ "کچھ نہیں اماں ..... گھر سے باہر کہیں کچھ گرا ہوگا۔" چاند میاں کی پھپھو شبانہ کچن میں شامی کبابوں سے نبرد آزما تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولیں۔

اوسان ذرا بحال ہوئے تو چاند میاں کو اپنا بھولا ہوا مشن یاد آیا۔ جھٹ سے انہوں نے جار کھولا اور دونوں ہاتھوں سے حلوہ کھانے

لگے۔ جیسے عموماً عید کی چہل پہل ہوتی ہے ویسے ہی ہر ایک طرف چہل قدمی تھی۔ ترنم گرم جوشیوں کا وقت گزرتا کب ہو گئے انہیں کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

آج انہیں یاد تھا کہ وہ تمام بھی کرنی ہیں جو ہو جانے کی۔

اس نے چاند رات کو جب دیکھا تو وہ بچے تھے تھوڑا سا ناراض ہو گیا تھا کیونکہ میں شریف اور چاند اور عید جانے والا ہے اور گھر سے باہر نکلے۔ ممی جی... چاند کہاں ہے؟" دونوں بچے دوستوں کی رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"تم نے جی میں نے بھی اسے کافی دیر سے نہیں دیکھا میں تو گی تمہارے پاس ہے۔" وہ پیچھے سے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے بولی۔ جس پر اس وقت قصبے پر وہ شریف چل رہا تھا جس میں وہ گئی تھی۔ "اچھا... وہ اپنی بیگم کے ساتھ عید کا چاند دیکھا ہوگا میں نے تو اسے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ جا کر والدہ سے پوچھے۔" ہاں ہنس ہنس کر بتا رہی تھیں۔

"مجھے خیال ہے وہ بیگم کے ساتھ پارک گیا ہوا ہے۔ دراصل بچے پارک سے بچوں کی واپس لے کر آئی تھیں۔ اصل میں چاند میاں کچھ دیر ہونے کے بعد نکلی عید منانے تھے اس لیے عید کا چاند کب نکلتا ہے، کیسا ہوتا ہے، عید کیسے مناتے ہیں؟ یہ سارے سوال ان کے لیے بہت اہم تھے۔ کچھ دیر بعد افطاری کے لیے وہ دونوں ہی واپس چلے سب ہی جمع ہو گئے۔ لیکن چاند کسی کے ساتھ بھی نہیں تھا۔

"ارے چاند کہاں ہے، تمہارے ساتھ نہیں، ہم تو سمجھے تمہارے ساتھ ہوگا؟" ہر کوئی ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔ چاند میاں ابھی چھوٹے تھے اور اکیلے گھر سے باہر کبھی نہیں نکلتے تھے۔ دونوں چاچو گھبرا کر انہیں قریبی پڑوس کے گھروں میں ڈھونڈنے چل پڑے۔ دادا مسجد کی طرف گئے تو بابا جنرل سٹور کی طرف اور ان کے منہ سے جس نے بھی سنا کہ چاند میاں نہیں مل رہے وہ بھی اس تلاش میں ان کا ہمرکاب ہو گیا۔ محلے کی دونوں مسجدوں میں بار بار اعلان دہرایا جانے لگا کہ جس کسی کے پاس چاند میاں ہوں وہ انہیں ان کے گھر چھوڑ جائے کیونکہ بچے کے لواحقین سخت پریشان ہیں۔ لیکن چاند میاں کی کچھ خبر نہ تھی۔

دوسرے محلے کی بڑی عورتیں اور قریبی ہمسائے گھر والوں کو دلاسا دینے آ پہنچے تھے۔ ہر طرف طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں اور عجیب چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کسی نے کہا آج کل گلی محلوں سے بچے اٹھا لیے جا رہے ہیں۔" ایک عورت نے اپنی بات زور دار لہجے میں کہی۔

"ہاں جی... سنا ہے فقیر ان کو پکڑ کر معذور کر دیتے ہیں اور بھیک منگواتے ہیں۔" دوسری نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ارے میں نے تو خود اخبار میں پڑھا ہے۔ فقیر بچوں کے کرنے پر لیتی ہے ان کا کاروبار بھی بہت عروج پر ہے۔" تیسری نے اپنے علم کا اظہار کیا۔ "نہیں... نہیں... نہیں۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا میرے لال کو۔" امی ہسٹیریکل ہو کر چلانے لگیں۔ شاید چچی پر تو جیسے غشی سی طاری ہونے لگی۔ دادا پھپھو انہیں سنبھال رہی تھیں۔ دادو نے یہ حال دیکھا تو سب کو وہاں سے ہٹانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ انہیں لے کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ "منحوسو! ہمدردی کرنے آئی ہیں یا جان لینے۔" وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ "آ بہو تو یہاں بیٹھ۔ ہمارا چاند کہیں کھیل رہا ہوگا گھبرا مت، خدا کو یاد کر۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ضرور ہماری سنے گا۔" اپنے بولتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ چاند میاں کی امی

کو دلاسے دے رہی تھیں۔ لیکن دادی کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔ کہاں ہے میرا بچہ۔۔۔ کہاں ہوگا میرا بچہ لال۔ وہ تو کبھی گھر سے بھی نہیں نکلا اکیلا۔ راستوں سے انجان کہاں بھٹک رہا ہو گا۔ مجھے میرا بچہ لا دیجیے لال۔ مجھے میرا بچہ لا دیجیے۔"

"مت میری بچی! مت رو، اس طرح مت رو، کہیں نہیں جائے گا ہمارا بچہ۔ نعیم اور سلیم گئے ہیں آس پاس پڑوس دیکھنے۔ بیٹھا ہو گا کسی بچے کے پاس۔" وہ ان کا سر اپنے سینے سے لگا کر بولیں۔ "پیارا بھی تو اتنا ہے جو دیکھتا ہے اٹھا لیتا ہے، پیار کرنے لگتا ہے۔" شبانہ پھپھو ان دونوں کے لیے پانی میں گلوکوز ملا کر لائی تھیں۔

"صبح سے پوچھ رہا تھا عید کا چاند کب نکلے گا۔ میں نے اسے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ جا کر دادو سے پوچھ لو۔" امی کا رو رو کر برا حال تھا۔ "مت رو! بہو مت رو ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ارے۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔ یہ موئی نصیبن نے دوپہر کو ٹرنک کھولا تھا کپڑے رکھنے کے لیے اور ڈھکنا اب تک کھلا ہے۔ اے شبانہ ذرا ٹرنک ٹھیک سے بند کر دیو۔ کہیں کوئی چوہا ہی نہ گھس جائے۔" بہو کو چپ کراتے دادو کی نظر اچانک ٹرنک پر پڑی تھی۔ پھپھو اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھیں پھنستے ہوئے کنڈے نکالنے کے لیے انہوں نے ڈھکنا کھولا تو چلا کر رہ گئیں۔ "حلوہ چور۔۔۔ یہاں سو رہا ہے۔" روتے روتے وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی تھیں۔ "کیا ہوا شبانہ؟" دادو نے حیرت سے پوچھا۔ "امی۔۔۔ آپ کا چاند۔" انہوں نے چاند میاں کو اٹھا کر دادو کی گود میں ڈال دیا۔ اسی وقت باہر محلے کی چھتوں پر ایک شور اٹھا۔ "مل گیا۔۔۔ مل گیا۔۔۔ وہ رہا چاند۔ مبارک ہو چاند مل گیا۔"

"مبارک ہو بہو۔ ہمیں بھی ہمارا چاند مل گیا۔" دادو چاند میاں کا ماتھا چومتے ہوئے خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں۔ "دادو۔۔۔ چاند مل گیا؟" چاند میاں نے مچل کر ان کی گود سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بیٹا مل گیا۔" چاند میاں ان کی بات سنے بغیر سیڑھیوں کی طرف بھاگ چکے تھے۔

"صبح سے ڈھونڈ رہا تھا اب ملا ہے چاند۔" وہ کہہ رہے تھے۔ پھپھو اور امی بے اختیار ہنسنے لگیں۔ "بیٹا ابھی عید کے چاند کا اعلان ہو گا۔ کسی سے کہہ کر اپنے چاند کے مل جانے کا بھی اعلان کرا دو۔ تاکہ اس کی تلاش میں نکلے ہوئے تمہارے ابا اور بھائی گھر آ جائیں۔ ابھی تک کسی نے ڈھنگ سے روزہ افطار نہیں کیا۔" دادو شبانہ پھپھو سے کہہ رہی تھیں۔

چھت پر ہی چاند میاں کے ساتھ عید کا چاند دیکھتے ہوئے، اپنے چاند کی خیریت اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

پہلا سبق

نذیر انبالوی

ڈھول کی تھاپ پر چوہدری مبارک کے کارندے دھمال ڈالتے ہوئے میلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"تیز ڈھول بجاؤ۔" چوہدری مبارک چلایا۔

ڈھول کی آواز تیز ہوئی تو دھمال ڈالنے والے بھی مزید جوش میں آ گئے تھے۔ یہ لوگ جہاں جہاں سے گزر رہے تھے لوگ کھڑے ہو کر انھیں دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے لیے یہ منظر کوئی نئی بات نہ تھی۔

"دیکھو آج کیا ہوتا ہے؟" ماموں کریانہ والے کی دکان پر کھڑے طفیل نے شوکت کو مخاطب کیا۔

"میرا خیال ہے اس مرتبہ جوڑ برابر کا ہے۔" شوکت بولا۔

"نہ بھئی نہ اس مرتبہ بھی چوہدری اقبال کا کتا اے وان ہے۔" یہ آواز قمر کی تھی۔

"تم ٹھیک نہیں کہہ رہے، کتے دونوں برابر کے ہیں۔" طفیل بولا۔

وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ چوہدری اقبال بھی اپنے بیلیوں کے ساتھ ڈھول کی تھاپ پر میلے کی طرف روانہ ہوا۔ چوہدری اقبال کے سر پر ایک پگڑی تھی جس کا شملہ چوہدری کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی مونچھوں کو بار بار تاؤ دے رہا تھا۔

"میں دیکھوں گا کہ آج موتی کو کون شکست دے گا۔" چوہدری اقبال نے موتی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری جی پچھلے سال کی طرح اس بار بھی فتح موتی کی ہو گی۔" چوہدری کے خاص بندے راجو نے موتی کی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے موتی اپنے دشمن سے ٹکرانے کے لیے بے چین ہے اسی لیے تو تمہارے ہاتھوں میں بے چین ہوتے جا رہا ہے۔" چوہدری اقبال بولا۔

"چوہدری جی ایسی ہی بات ہے۔ میں نے سال بھر اس پر خوب محنت کی ہے، یہ اپنے دشمن کو شکست دے کر فاتح بن کر لوٹے گا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ہے۔" راجو کی بات سن کر چوہدری اقبال نے کہا۔

"راجو ایسا ہی ہو گا۔"

اب میلہ کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ بہت سی دکانیں سجی ہوئی تھیں جن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد خریداری میں مصروف تھی۔ یہ میلہ ہر سال بابا سبز شاہ کے مزار پر سردیوں کے آغاز پر لگتا تھا۔ بچوں بڑوں کی دلچسپی کا بہت سا سامان اس میلے میں موجود ہوتا تھا۔ سرکس، موت کا کنواں، بھیک شو اور جھولے خاص طور پر لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ ان دلچسپیوں

کے علاوہ ہر سال لوگوں کو جن دو مقابلوں کا شدت سے انتظار ہوتا تھا ان میں کشتی، کبڈی اور کتوں کی لڑائی قابل ذکر تھیں۔ ابتدائی طور پر بہت سے کتوں کے درمیان مقابلہ ہوتا پھر ان میں سے بہتر کتوں کا سیمی فائنل اور پھر فائنل کے لیے انتخاب کیا جاتا۔ پچھلے کئی برسوں سے چوہدری اقبال اور چوہدری مبارک کے کتے فائنل تک پہنچ رہے تھے۔ اس سال بھی دونوں کے ہی کتے فائنل تک پہنچے تھے۔ دونوں چوہدری کتوں کی اس لڑائی کے لیے اتنا سنجیدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے اس کو اپنی عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ دونوں نے کتوں کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی ملازموں کو رکھا تھا۔ کتوں کی خوراک کا بہترین انتظام تھا۔ جب ان کو کسی اعلیٰ نسل کتے کا پتا چلتا وہ اس کو خریدنے کے لیے بے تاب ہو جاتے۔ کچھ عرصہ قبل ہی لاہور سے ایک شخص کتوں کے پلے لے کر چوہدری مبارک کے گاؤں پہنچا تو کسی طرح چوہدری اقبال کو اس بات کا علم ہو گیا تھا اس نے خصوصی طور پر ایک بندے کو اس مقصد کے لیے بھیجا کہ وہ منہ مانگے داموں دے کر کتے کے پلے خرید لائے۔ اس بندے نے آنے میں دیر کر دی تھی کیونکہ چوہدری مبارک پلے خرید چکا تھا۔

اب دونوں چوہدری میلے میں آمنے سامنے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کے کارندے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ کتے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔

"کیوں اپنے کتے کو مروانے کا ارادہ ہے، یہ چوہا میرے شیر کا کیا مقابلہ کرے گا۔" چوہدری مبارک نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"چوہا۔" چوہدری اقبال نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا تو اس قہقہے میں اس کے وفاداروں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

"میں ٹھیک تو کہہ رہا ہوں، یہ چوہا...."

"بس آگے بکو مت کہنا میدان لگے گا تو پھر دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا کہ کون چوہا ہے اور کون شیر۔ میرا موتی کل بھی شیر تھا اور آج بھی شیر ہے۔" چوہدری اقبال غرایا۔

"اب بھی موقع ہے اپنے موتی کو میرے ٹائیگر سے بچا لو یہ پچھلے سال والا ٹائیگر نہیں ہے، یہ فولاد ہے فولاد اس کے سامنے موتی تو کچھ بھی نہیں۔" چوہدری مبارک نے اپنے ٹائیگر کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ابھی یہ گرما گرم جملوں کا تبادلہ جاری تھا کہ میلے کی انتظامیہ نے موتی اور ٹائیگر کی لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ اعلان سن کر لوگ تیزی سے مقابلے کے میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ دونوں کتوں کو جب میدان میں لڑائی کے لیے چھوڑا گیا تو تماشائیوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ دونوں پارٹیوں کے حامی نعرے بازی میں مصروف تھے۔ کہیں سے آواز آ رہی تھی کہ "موتی ہمارا شیر ہے باقی سب ہیر پھیر" ٹائیگر کے حامی اس کے لیے نعرے بلند کر رہے تھے۔ جب مقابلہ ختم ہوا تو ٹائیگر نے موتی کو مار بھگایا تھا۔ جب موتی اپنی جان بچانے کے لیے پیچھے کی طرف پلٹا تو چوہدری اقبال نے شور مچایا۔

"موتی ہمت کرو، آگے بڑھو۔"

جب کہ چوہدری مبارک بار بار چلا رہا تھا۔

"ٹائیگر دشمن کو مار بھگاؤ، ٹائیگر آگے بڑھو۔"

جیوری کے فیصلے کے مطابق ٹائیگر کو فاتح قرار دیا گیا چوہدری اقبال کب اپنی شکست تسلیم کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے ملازموں کو اشارہ کیا تو وہ حملہ کرنے کے لیے چوہدری مبارک کی طرف بڑھے۔ ان کے ایسا کرنے کی دیر تھی کہ کتوں کی لڑائی کا میدان انسانوں کی لڑائی میں بدل گیا تھا۔ اس لڑائی میں دونوں چوہدری تو محفوظ رہے مگر ان کے کئی کارندے زخمی ہو گئے۔ اس لڑائی کی خبر دونوں کے بیٹوں تک بھی جا پہنچی تھی۔ دونوں شہر کے ایک بہترین تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم تھے۔ دونوں ہاسٹل میں رہتے تھے۔ جب چوہدری مبارک کو علم ہوا تھا کہ چوہدری اقبال کا بیٹا گرین پبلک سکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس نے جب ایسا کیا تو منشی ریاض نے پوچھا تھا کہ انھوں نے اسی سکول میں اپنے بیٹے کو کیوں داخل کروایا ہے جہاں سے پہلے چوہدری اقبال کا بیٹا زیر تعلیم ہے۔ اس کے جواب میں چوہدری مبارک نے کہا تھا کہ یہ ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے وہاں چوہدری اقبال کا بیٹا پڑھ سکتا ہے تو میرا بیٹا کیوں نہیں۔ اس نے پہلے دن ہی اپنے بیٹے کو کہہ دیا تھا کہ وہ چوہدری اقبال کے بیٹے سے دور رہے مگر یہاں تو صورت حال

ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ دونوں قائداعظم ہاؤس میں تھے۔ دونوں کو اسمبلی میں ایک جگہ ہی کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ چوہدری اقبال نے اپنے بیٹے کا ہاؤس تبدیل کروانے کی کوشش کی مگر ایسا نہ ہو سکا۔

نومبر کے آخر میں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے شروع ہوئے۔ اسکول کے مختلف ہاؤسز نے بہت سے کھیلوں میں حصہ لینا تھا۔ قائداعظم ہاؤس کا پہلا کرکٹ میچ لودھی ہاؤس سے تھا۔ چوہدری اقبال کا بیٹا دانیال اور چوہدری مبارک کا بیٹا لیاقت ٹیم میں شامل تھے۔ دانیال نے افتتاحی بلے باز کی حیثیت سے کھیل کا آغاز کیا تھا۔ اس کے ساتھی کھلاڑی جلد آؤٹ ہو گئے تھے اس لیے چوتھے نمبر پر لیاقت میدان میں موجود تھا۔ دونوں دشمنوں کے بیٹے بیٹنگ کر رہے تھے۔ دانیال نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ وہ لیاقت کو جان بوجھ کر رن آؤٹ کروا دے مگر اگلے ہی لمحے اس نے اس سوچ کو جھٹک دیا کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے ہاؤس کا نقصان تھا۔ دونوں نے جم کر بیٹنگ کی اور اپنے ہاؤس کے لیے مقررہ اوورز میں دو سو رنز بنا کر اپنے ہاؤس کی پوزیشن مضبوط کر دی۔ ان کا ہاؤس آسانی سے یہ میچ جیت گیا۔ دانیال کو مجموعی کارکردگی کی بنیاد پر میچ کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔

"دانیال تمہیں بہت مبارک ہو۔" لیاقت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو، اس جیت میں تم میرے برابر کے شریک ہو۔" دونوں کے ہاتھ ملانے کی دیر تھی کہ اس مبارک گھڑی ان کے درمیان دوستی جیسے عظیم اور انمول رشتے نے جنم لے لیا تھا۔ دونوں ایک ہی عمارت میں رہتے ہوئے پہلے جتنے دور تھے اب اتنے ہی قریب آ گئے تھے۔ جب سپورٹس ڈے کے موقع پر ان کے ہاؤس کو بہترین ہاؤس کا انعام دیا گیا تو دونوں بہت خوش تھے۔ یہ جس قدر قریب ہوتے جا رہے تھے ان کے والد اسی قدر ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ جب میلے میں موتی اور ٹائیگر کی لڑائی کی خبر ان کو ملی تھی تو لیاقت نے ازراہ مذاق دانیال سے کہا۔

"دیکھا ہمارے ٹائیگر کا کمال موتی کو نانی یاد کروا دی ہے۔"

"میں ایک ہاتھ دوں گا تو تمہیں اپنی نانی یاد آ جائے گی۔"

دانیال تو سنجیدہ ہی ہو گیا تھا۔

"بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ جو آگ ہمارے والد لگائے بیٹھے ہیں ہمیں اس آگ کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ ہمیں دشمنی کی اس

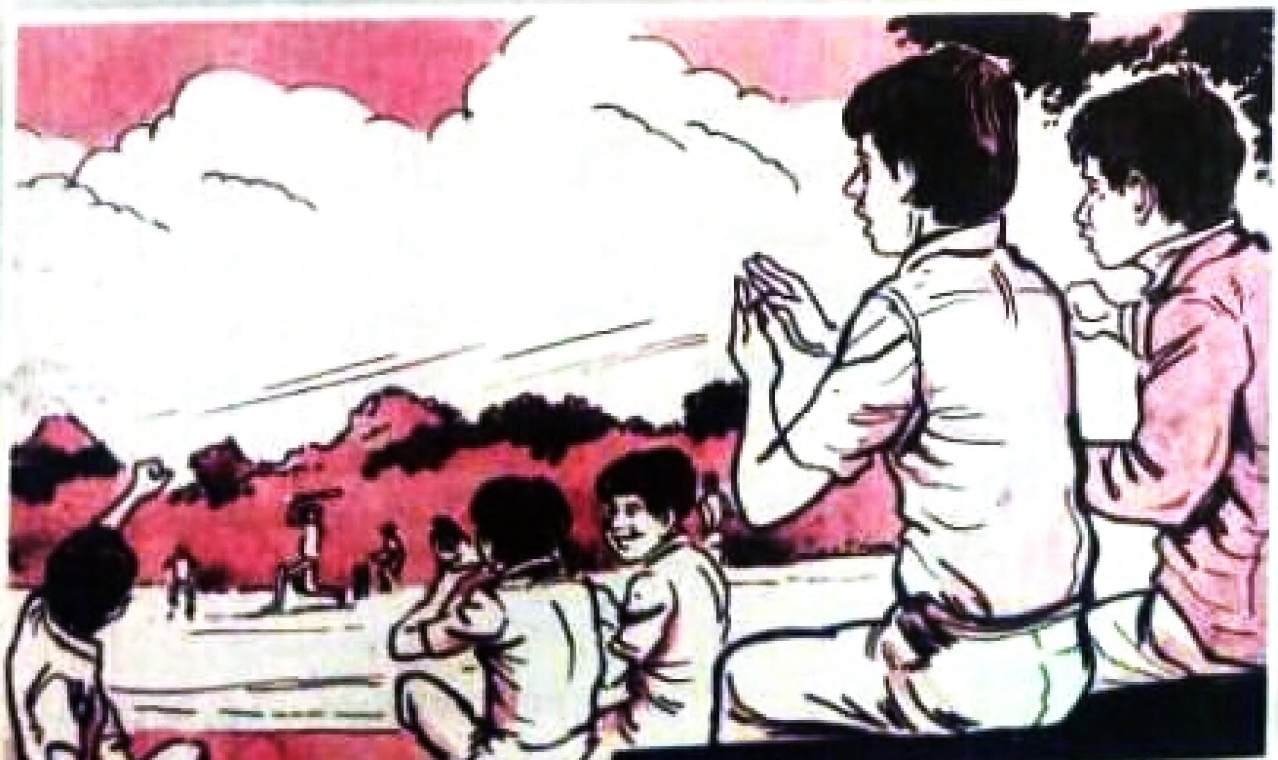

آل کو پھنسانا چاہیے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" دانیال نے پوچھا۔

"ہاں ایسا ممکن ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تو ادھر کان لاؤ۔"

دانیال ساری بات سن کر بولا۔

"یہ کام خطرناک نہیں ہے؟"

"کچھ حاصل کرنے کے لیے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہمیں اس سلسلے میں بزرگ لوگوں سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔" لیاقت بولا۔

سردیوں کی چھٹیوں میں دونوں اپنے اپنے گاؤں پہنچے۔ دونوں کا موبائل فون کے ذریعے رابطہ تھا۔ انھوں نے گاؤں آتے ہی اپنے مشن پر کام شروع کر دیا تھا۔

"کیا بک رہے ہو؟" چودھری مبارک چلایا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ ٹائیگر غائب ہے۔"

"کہاں گیا ہے میرا ٹائیگر۔" ملازم کی بات سن کر چودھری مبارک دھاڑا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"یہ ضرور چودھری اقبال کی کارروائی ہے۔ وہ اپنے موتی کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ میں اب اس سے ایسا بدلہ لوں گا کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا۔" چودھری مبارک غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

لیاقت یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے دانیال سے موبائل فون پر رابطہ کر کے صورت حال معلوم کی تو اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد چودھری اقبال بھی چودھری مبارک کی طرح اپنے کتے کی پُراسرار گمشدگی پر غصے سے بے قابو ہو رہے ہیں۔

"اب غصے سے بے قابو ہونے والوں کو سنبھالنا ہم دونوں کی ذمہ داری ہے۔" لیاقت نے دانیال کو سمجھایا۔

"ہاں ہم دونوں نے یہ کام کرنا ہے، چلو اب باتیں ختم اور کام شروع۔ ہمیں اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ جانا چاہیے۔" دانیال بولا۔

اب دونوں اپنے اپنے والد کے سامنے موجود تھے۔ دونوں ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"میں اگر کہوں کہ آپ کا کتا چودھری اقبال نے نہیں چرایا تو ...."

"میں یہ نہیں مان سکتا۔ یہ حرکت اسی کی ہے۔" چودھری مبارک نے اپنے بیٹے کی بات بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔

"چودھری اقبال کا بھی تو یہی کہنا ہے کہ آپ نے ان کا موتی چرایا ہے۔"

"یہ جھوٹ اور بے بنیاد بات ہے، میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"تو چودھری اقبال نے بھی آپ کا کتا نہیں چرایا۔" لیاقت نے جواب دیا۔

"تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔" چودھری مبارک نے لیاقت کو گھورا۔

"بس مجھے یقین ہے کہ چودھری اقبال نے ہمارا کتا غائب نہیں کروایا۔ آپ تحمل کا مظاہرہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" لیاقت نے کہا۔

"میں چودھری اقبال کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ آپ چودھری اقبال کو نہ چھوڑیں۔ آپ مجھے کچھ وقت دیں میں ٹائیگر کا خود سراغ لگاؤں گا۔"

"تم یہ کام کرو گے۔" چودھری مبارک کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں میں یہ کام کروں گا۔ آپ مجھے صرف ایک ہفتے کا وقت دیں۔ میں جب ناکام ہو جاؤں گا تو پھر آپ جیسا کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔" چودھری مبارک اپنے بیٹے کی بات سن کر سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس نے چند منٹ سوچا اور پھر لیاقت کو ایک ہفتے کا وقت دے دیا۔ ادھر دانیال نے بھی اپنے والد سے بھی موتی کا سراغ لگانے کے لیے ایک ہفتے کا وقت لے لیا تھا۔ دونوں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے منصوبے کو تکمیل کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان کا آپس میں مسلسل رابطہ تھا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد دونوں نے کتوں کے ملنے کی اپنے اپنے والد کو اطلاع دی تھی۔

"کیا میرا موتی مل گیا ہے؟" چودھری اقبال کی خوشی دیدنی تھی۔

"ہاں ابو جان ایسا ہو گیا ہے۔"

"کہاں ہے میرا موتی؟" چودھری اقبال بے چین ہوئے جا رہا تھا۔

"اسی علاقے میں آپ کا موتی ہے۔"

"کس کے پاس ہے میرا موتی میں اس کو نہیں چھوڑوں

کہ "چوہدری اقبال کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔

"ابو جان صبر تھوڑی دیر، چند گھنٹوں بعد آپ کو موتی مل جائے گا۔" دانیال بولا۔

شام کے وقت طے شدہ پروگرام کے مطابق دانیال، چوہدری اقبال اور لیاقت، چوہدری مبارک کے ساتھ نمبر کے ساتھ پرانی حویلی میں موجود تھے۔ دانیال اور لیاقت نے آپس میں ہاتھ ملایا تو دونوں کے والد نے انھیں گھورا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان کے بیٹے انھیں یہاں کیوں لائے ہیں۔ وہ ابھی حیرت کے سمندر میں گم تھے کہ لیاقت نے اپنے والد چوہدری مبارک کو مخاطب کیا تھا۔

"ابو جان اس کھڑکی سے اپنے ٹائیگر کو دیکھیں۔"

"ابو جان آپ بھی اپنے موتی کو دیکھ لیں۔" دانیال بولا۔

دونوں چوہدری آگے بڑھے اور کھڑکی سے کمرے میں جھانکنے لگے۔ دونوں کے لیے اندر کا منظر ناقابل یقین تھا۔ ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ موتی اور ٹائیگر ایک ہی برتن میں دودھ پی رہے تھے۔ لڑائی کے میدان میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دینے والے کتے آپس میں لڑنے کی بجائے پیار و محبت سے اکٹھے دودھ پی رہے تھے۔ دونوں چوہدری سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔ ان کے بیٹے انھیں اس راستے پر لے آئے تھے جو صلح کی طرف جاتا تھا۔ موتی اور ٹائیگر کو اکٹھے دیکھ کر دونوں شرمندہ ہوئے تھے کہ یہ حیوان ہو کر مل بیٹھے ہیں اور ہم انسان ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ دونوں چوہدری ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور پھر ایک جھٹکے سے گلے لگ گئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا دانیال اور لیاقت کو شدت سے انتظار تھا۔ دونوں نے ملازمین کے ساتھ مل کر ایک ہفتہ کتوں کو اس ماحول میں رکھا تھا کہ وہ آپس میں شیر و شکر ہو گئے تھے۔ دونوں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ کامیاب بھی کیوں نہ ہوتے انھوں نے اس بات پر عمل کیا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ الحجرات میں کیا ہے کہ "اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔" دونوں چوہدری جب بغل گیر ہوئے تو فضا محبت کی خوشبو سے معطر ہو گئی تھی۔ دونوں اپنے بیٹوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جنھوں نے انھیں کم عمر ہونے کے باوجود ایک بہترین سبق دیا تھا۔ یہ پہلا سبق تھا جو انھیں اپنے بیٹوں کی طرف سے ملا تھا۔ اس سبق کے بعد دونوں نے باہم فیصلہ کیا کہ وہ آپس میں محبت سے رہیں گے اور آئندہ کبھی گاؤں کے میلے میں کتوں کی لڑائی نہیں ہوگی۔

☆☆☆

تمنا پوری نہ ہوئی

کریم نے فرش کی صفائی کرتے کرتے نظر اٹھا کر بیگ صاحب کو دیکھا۔ بیگ صاحب اخبار پڑھنے میں مصروف تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے ہی بڑے شوخ انداز میں کہا "ونڈرفل" اور پھر اخبار ایک طرف رکھ کر آرام کرسی پر آدھے لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی اہم بات پر غور کر رہے ہوں۔ بیگ صاحب کی صحبت میں اتنی انگریزی تو اب کریم کو بھی آ گئی تھی کہ وہ ونڈرفل، ایکسی لنٹ، ویل گڈ، ویری بیڈ اور اسٹوپڈ جیسے الفاظ کے نہ صرف معنی سمجھ لے بلکہ ان سے یہ اندازہ بھی لگا لے کہ بیگ صاحب کا موڈ کیسا ہے؟ اس وقت اس نے ان کے منہ سے ونڈرفل سنا اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی دیکھی تو اپنی پرانی خواہش کا ایک بار پھر اظہار کر دیا۔

"میاں جی۔ وہ اپنی بات آپ کو یاد دلائی ہے۔"

بیگ صاحب نے آدھی آنکھیں کھولیں۔ اور کریم کو دیکھتے دیکھتے ان کی مسکراہٹ اتنی بڑھی کہ پوری آنکھیں کھل گئیں۔

کریم نے سوچا کہ بہترین موقع ہے۔ اس نے فوراً گرم لوہے پہ چوٹ ماری۔ "میاں جی وہ میرے دانتوں کے چوکے کا کچھ کر دیں۔ ایمان سے نہ کھانے کا مزا ہے اور نہ ٹھیک سے بولا جاتا ہے۔ پھر پوپلا منہ بڑا برا لگتا ہے کہ ایمان سے میں نے تو شیشہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ دیکھیں آپ کا چہرا دانت لگنے کے بعد کیا جوان جوان لگتا ہے ماشاء اللہ۔"

کریم نے جس انداز سے ماشاء اللہ کہا اس پر تو بیگ صاحب کو ہنسی آئی لیکن جوان جوان لگنے کی بات پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور کہنے لگے۔

"ارے کریمو فکر نہ کر۔ بس اب تھوڑے دن کی بات ہے۔ تجھے ایسی بتیسی بنوا کر دوں گا کہ تیرا دل خوش ہو جائے گا" یہ کہہ کر بیگ صاحب نے پھر اخبار اٹھایا اور صفحے پلٹ کر کسی خبر پر نظریں جما دیں۔ اس بار تو مسکراہٹ ایسی پھیلی کہ ہونٹوں کے دونوں کونے کانوں کی لوؤں کو چھونے لگے۔ کچھ دیر بعد بیگ صاحب اٹھے اور میز کی دراز میں سے قینچی نکال کر اخبار سے وہ خبر کاٹی اور اسے احتیاط سے یہ کہتے ہوئے رائٹنگ پیڈ میں رکھ دیا "اب رات کو اطمینان سے پڑھوں گا۔"

کریم نے اپنا کام ختم کر کے کن انکھیوں سے بیگ صاحب

بیگ صاحب کی بہو ٹی وی لاؤنج
دیکھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ان کے قریب جا کر کریم نے کہا "امان
جی آج تو بڑے صاحب بہت ہی خوش ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

بہو نے کریم سے تو کچھ نہ کہا لیکن وہ چار منٹ میں لاؤنج سے اٹھ کر بیگ صاحب کے کمرے میں پہنچیں۔ بہو کے سلام کا جواب دینے کے بعد بیگ صاحب خوش ہو کر بولے "بہو بھی خاطر۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ بیٹی ایک چھوٹا سا کام ہے۔ تم جب بازار جاؤ تو ..." یہ کہہ کر بیگ صاحب الماری کے پاس گئے، اسے کھولا اور وہاں سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ بہو کو تھماتے ہوئے بات وہیں سے شروع کی "میرے لیے ایک کالنگ کارڈ لیتی آنا۔"

بہو نے ذرا حیران ہو کر پوچھا "ابا آپ پانچ سو روپے کے کالنگ کارڈ کا کیا کریں گے؟ آج کل تو سو روپے کے کارڈ میں بڑی دیر تک بات ..."

بیگ صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اوہو! تم تو وکیلوں کی طرح جرح شروع کر دیتی ہو۔ ارے بیٹی کچھ سوچ سمجھ کر ہی پانچ سو کا کارڈ منگوا رہا ہوں۔ وہ لندن راشد کو فون کرنا ہے۔ لمبی بات ہو جاتی ہے۔ خالی خیر و عافیت ہی تھوڑا دریافت کرنا ہوتی ہے۔ ارے بہو پچپن سال کی دوستی ہے۔ ہر سال کا ایک منٹ بھی رکھو تو تو پچپن منٹ تو بات ہونا ہی چاہیے۔" یہ کہہ کر بیگ صاحب ایسے ہنسے جیسے بہت زبردست جملہ کہہ دیا ہو۔ بہو نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھ گئی، راشد انکل پاکستان آنے والے ہیں نا... اب آپ پچپن منٹ میں ان سے پچپن چیزیں لانے کی فرمائش کریں گے۔"

بیگ صاحب اب موڈ میں آ چکے تھے۔ انھوں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے "کہ پچپن چیزیں منگواؤں گا تو اس میں سے پچاس تمھاری، تمھارے بچوں کی اور تمھاری ساس کی ہوں گی۔ لیکن سنو۔ اس بار مجھے صرف ایک چیز کی فرمائش کرنا ہے۔ پر وہ چیز ہے زبردست۔"

یہ کہہ کر بیگ صاحب نے میز پر رکھا ہوا رسالہ پھر اٹھا لیا اور درمیان میں بند کر دیا جیسے ڈر رہے ہوں کہ بہو اس کے بیچ میں رکھا ہوا اخبار کا تراشہ نہ دیکھ لے۔

رات کو بڑی دیر تک دونوں دوستوں میں ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی۔ گفتگو کے آخری جملے یہ تھے۔

"کمرے کہہ تو دیا لیتا آؤں گا۔ ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ آخر منگوا کس کے لیے رہے ہو؟"

"یار وہ دفتر کے ایک پرانے ساتھی ہیں۔ بڑے شریف انسان ہیں۔ ان کا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ اسے اپنے کلینک کے لیے چاہیے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی آپ لندن جاتے رہتے ہیں ہمارا یہ کام کر دیں۔ میں نے بتایا کہ میں تو اس سال نہیں جا رہا لیکن میرے ایک عزیز دوست آنے والے ہیں۔ وہ یہ کام کر دیں گے۔ بس اس دن سے وہ پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھو یار مجھے ان سے شرمندہ نہ کرانا۔ اور ہاں ... پیسوں کی بالکل فکر نہ کرنا جیسے ہی آؤ گے اس کی قیمت تمھیں مل جائے گی۔ ساری تفصیل نوٹ کر لی ہے نا؟"

"ہاں ہاں یار سب نوٹ کر لیا۔ تم اس کی قیمت بھی دے دینا لیکن اس وقت میری جان چھوڑ دو۔"

بیگ صاحب نے ٹیلی فون بند کر کے زور کی انگڑائی لی اور بستر پر لیٹ گئے۔

راشد سے ملاقات اور ساتھ وقت گزارنے کی خواہش تو بیگ صاحب کے دل میں ہمیشہ رہتی تھی۔ لیکن اس بار یہ کچھ زیادہ ہی تھی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن آ ہی گیا کہ راشد صاحب لاہور پہنچے۔ ایئرپورٹ سے گھر تک راستے میں بہت سی باتیں ہوئیں لیکن راشد نے اس چیز کا ذکر نہ کیا جو بیگ صاحب نے منگوائی تھی۔ گھر پہنچ کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں لیکن پھر بھی راشد نے کچھ نہ کہا۔ آخر بیگ صاحب سے صبر نہ ہوا۔ پوچھ ہی لیا۔ "یار وہ ہماری چیز بھی لائے؟"

راشد مسکرا کر بولے "ارے بھائی لایا ہوں۔ ذرا دم تو لینے دو۔ سامان کھولوں گا تو دے دوں گا۔ لیکن یار وہ تمھارے ڈاکٹر صاحب بالکل گھامڑ ہیں۔ انھیں یہ ہی نہیں پتہ کہ یہ آلہ اب پاکستان میں بھی مل سکتا ہے۔ یہ 2004ء میں ایجاد ہوا تھا اور اب دو سال بعد یعنی 2006ء میں یہ بہت سے ملکوں میں دستیاب ہے۔ بہرحال تمھاری فرمائش پوری کرنے کے لیے میں وہاں سے لے کر آیا ہوں اور یہاں ایجنسی کا پتہ بھی لے آیا ہوں۔ تاکہ اگر کوئی خرابی ہو یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو ان سے رابطہ کر لیا جائے۔"

بیگ صاحب نے حیران ہو کر کہا "لیکن یہ میں نے تو یہ
خبر ابھی تمہیں بتانے سے پہلے پڑھی بھی۔"
راشد بولے "یہ تو نہیں معلوم۔ شاید پہلے آئی ہو اور دیکھنے
میں دو سال لگ گئے ہوں۔ لیکن تم نے خبر کہاں پڑھ لی؟ تم تو کہہ
رہے تھے کسی ڈاکٹر نے منگوایا ہے؟"
بیگ صاحب بوکھلا گئے۔ پھر سنبھل کر بولے "ہاں ہاں بھئی
وہ اخبار کا تراشہ مجھے دکھانے لایا تھا میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ میں
نے وہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر بیگ صاحب اپنے کمرے
میں گئے اور وہاں سے تراشہ راشد کو تھما دیا۔ راشد نے جلدی جلدی
پڑھ کر کہا:
"یہ لکھا ہے کہ آلہ ایجاد ہونے کے بعد دو سال تک اس
پر تجربے ہوتے رہے اور تجربوں کی کامیابی کے بعد اب یہ کئی ملکوں
کی مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ خیر گولی مارو اسے۔ کوئی کام کی بات کرو۔"
راشد چند روز اسی خوشی لاہور میں گزار کر اسلام آباد روانہ
ہو گئے اور ادھر بیگ صاحب نے کئی دن تک اس پمفلٹ کا بڑے
غور سے مطالعہ کیا جس میں اسے استعمال کرنے کی ہدایتیں درج
تھیں۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد آخر اللہ کا نام لے کر
انھوں نے اس کا استعمال شروع کرنے کی ٹھان لی۔ آلے کے
استعمال کو انھوں نے پوشیدہ رکھا البتہ اسے استعمال کرنے
سے پہلے سارے گھر میں یہ اعلان کر دیا کہ نقلی دانتوں کی بتیسی میں
کسی خرابی کی وجہ سے وہ کچھ دن تک اسے استعمال نہیں کریں گے
کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے تالو میں زخم بن گیا ہے۔ زخم ٹھیک
ہونے تک وہ بغیر بتیسی کے کام چلائیں گے لہٰذا ناشتے میں انھیں
دلیہ دیا جائے، دوپہر کو پتلی کھچڑی اور رات کو شوربے میں ڈوبی ہوئی
روٹی یا اسی قسم کی کوئی اور چیز۔ اس عرصے میں وہ بات چیت بھی کم
کریں گے کیونکہ پوپلے منہ سے بولنا انھیں اچھا نہیں لگتا۔ اس
اعلان سے سب گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے بڑی
ہمدردی سے بیگ صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔
کہیں زخم بڑھ نہ جائے۔ لیکن ہمدردی جتاتے جتاتے ان سے رہا نہ
گیا۔ آخر میں مسکرا کر یہ جملہ بھی جڑ دیا۔ "چلو زخم کے بہانے کچھ
دن تو منہ بند رہے گا۔ ذرا سکون رہے گا گھر میں۔"

بیگم کی مسکراہٹ قائم رہی۔ آہستہ سے بولیں۔
"ارے بیگ صاحب! دو چار دن دلیہ اور کھچڑی کھا لو پھر
تو زخم خود بخود بھر جائے گا۔"
بیگ صاحب جھلا کر کچھ کہنے والے تھے کہ بہو بیچ میں آ
گئی "ابا چھوڑیئے یہ باتیں۔ میں شام کو آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے
چلوں گی۔ وہ کوئی مرہم یا کریم دے دیں گے لگانے کو۔"
"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اپنا علاج خود کر لوں گا۔
چند دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔"
بیگم نے بیگ صاحب کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے ہمدردی
جتائی۔ "نہیں خواہ مخواہ میں تکلیف بڑھ جائے گی۔ بہو تم انھیں
زبردستی لے جانا۔"
بیگ صاحب کا مزاج بگڑ چکا تھا۔ کمرے سے باہر جاتے
ہوئے بولے "ہونہہ۔ میں دو سال کا بچہ ہوں۔ زبردستی لے جاؤ۔"
بیگ صاحب کو دلیہ اور کھچڑی کھاتے کھاتے چار پانچ دن
گزر گئے۔ ایک دن کریم کمرے کی صفائی کے دوران بولا "میاں جی!
یہ دانتوں کے چوکے کے بغیر تو بڑی تکلیف ہوتی ہو گی آپ کو؟"
بیگ صاحب موڈ میں تھے "ارے بس اب دو ہفتے کی بات
اور ہے۔ اور اب ان نقلی دانتوں کی مجھے ضرورت ہی نہیں رہے گی۔
یہ تو میرے لئے بیکار ہیں۔"
بیگ صاحب کی اس بات پر کریم نے آنکھیں پھاڑ کر ان
کی طرف دیکھا اور حیران ہو کر بولا "میاں جی وہ کیسے؟"
بیگ صاحب بے پرواہی سے بولے "ارے دیکھتے جاؤ کریم۔
بس ایک معجزہ ہونے والا ہے۔"
کریم نے معجزے والی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ بڑی لجاجت
سے بولا "میاں جی آپ کو یہ نقلی بتیسی استعمال نہیں کرنا تو مجھے ہی
دے دیں۔ غریب کا بھلا ہو جائے گا۔"
بیگ صاحب نے پوچھا "کیا کرو گے اس کا؟"
کریم بیگ صاحب کے قریب آ کر بولا "میاں جی وہ میری
نئی بتیسی تو اللہ جانے کب بنے گی۔ میں نے سوچا اسی سے کام چلا
لوں۔ خالی پوپلے منہ سے تو بہتر ہے۔"
بیگ صاحب کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگے "ارے پاگل ہوا ہے

کوئی فرق تھوڑی ہے کہ ایک کی بتیسی دوسرے کے لگ جائے۔
ہر ایک منہ کی اپنی ناپ ہوتی ہے۔"

کریم کے پاس جواب تیار تھا "میاں جی آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے پڑوس میں جو انور دندان ساز ہے جی۔ وہ بڑا کاریگر ہے۔ وہ آپ کا بتیسی کا گھس گھسا کر ٹھیک کرے گا اور میرے منہ میں فٹ کر دے گا۔"

بیگ صاحب نے اسے ٹالنے کو کہا "اچھا دے دوں گا۔ تھوڑے دن صبر کرو۔"

بیگ صاحب کو پتلی کھچڑی کھاتے چھ ہفتے ہونے کو آئے اور اب ان کی حالت بھی پتلی ہو گئی۔ لیکن دل کی آرزو پوری ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ ادھر سارے گھر والے سخت پریشان تھے کہ آخر کیسا زخم ہے جو بھرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ سب کو یہ بھی حیرانی تھی کہ بیگ صاحب ڈیڑھ مہینہ گزر جانے کے بعد بھی اس ضد پر اڑے ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر کو نہیں دکھائیں گے۔ اور ظاہر میں ایسا لگتا تھا کہ انھیں کوئی تکلیف بھی نہیں ہے۔

خیر دلیہ، کھچڑی اور شوربے میں ڈوبی روٹی جب حلق سے اتارنا ممکن نہ رہا تو بیگ صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ اب کچھ نہ کچھ کارروائی کرنا چاہیے۔ گھر والوں سے ہر بات راز میں رکھی تھی لہٰذا ان سے کیا بات کرتے۔ آخر کچھ سوچ کر اس ایجنسی کا پتہ اور فون نمبر تلاش کیا جو پاکستان میں وہ آلہ درآمد کر رہی تھی پھر انھیں فون کر کے بتایا کہ یہ آلہ انھوں نے لندن سے منگوایا تھا لیکن یہ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ ڈیڑھ مہینے میں کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ جواب ملا "نتیجے کے لئے تین مہینے انتظار کیجئے۔"

بیگ صاحب نے چڑ کر روکھے لہجے میں کہا

"بھائی ٹھیک ہے۔ لیکن ڈیڑھ مہینے میں کچھ تو اثر ہوتا۔ کچھ تو نظر آتا۔" جواب ملا "زحمت کر کے آلہ ہمارے پاس لے آیئے۔ چیک کر لیں گے۔"

بیگ صاحب ایجنسی کے دفتر پہنچے تو پہلا سوال یہ کیا گیا "آپ بچے کو ساتھ نہیں لائے؟"

بیگ صاحب بوکھلا گئے۔ "کیا بچہ؟ کس کا بچہ؟"

جواب ملا "چلئے بچہ نہ سہی۔ جو بھی مریض ہے اسے ساتھ لے آتے تو ہمارے ماہر اس کا معائنہ کر لیتے۔"

بیگ صاحب ناراض ہو گئے "آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ ارے بھائی میں خود مریض ...... مطلب یہ ہے کہ میں خود اسے اپنے دانت اگانے کے لئے یہ آلہ پچھلے چھ سات ہفتے سے استعمال کر رہا ہوں۔ اور کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دانت نہیں نکلا کم بخت۔ بالکل بیکار ہے۔ پیسے ضائع ہو گئے میرے۔"

جس شخص سے بات ہو رہی تھی اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا اور دوسری طرف دیکھنے لگا لیکن اپنی ہنسی نہ روک سکا اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا:

"اس مشین سے آپ ... ہی ہی ہی ... میرا مطلب ہے کہ آپ اپنے ... ہی ہی ہی ..."

ہی ہی —— بھی پوری بتیسی؟
جن کے اپنے دانت اگ رہے تھے؟ اور یہ
ہی۔"

بیگ صاحب کا دل چاہا کہ دھاڑ کر اس سیلزمین کی پوری بتیسی باہر نکال دیں لیکن غصے پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"نہیں میاں میرے دانت اگنے پر آپ کی کمپنی نے کوئی پابندی لگائی ہے؟"

سیلزمین نے بھی غصے پر قابو پا لیا تھا۔ عاجزی سے بولا "میں اپنی بدتمیزی کی دلی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن میرے بزرگ آپ نے پڑھا نہیں۔ اس پمفلٹ میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ آلہ جو سالوں میں اگنے کے عمل سے آدھا ہے اور الٹراساؤنڈ پیدا کرتا ہے، مسوڑوں میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔ اسے بے طور میں دانتوں یا مسوڑوں میں دن میں تین مرتبہ استعمال کر لیا جائے تو کافی ہے اور یہ علاج بارہ دن میں ... اس آلے کو چلا دیا جائے تو اس سے پیدا ہونے والی الٹراساؤنڈ لہریں ٹوٹے ہوئے دانت کے مسوڑوں کی اس طرح مالش کرتی ہیں کہ ان میں خون کا بہاؤ بڑھ جاتا ہے اور دانت بننے والے ٹشو پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس آلے میں ایک ایسا پری پروگرامڈ چپ ہوتا ہے جو روزانہ اسے چلاتا اور بند کرتا ہے اور مریض کو اس کا کوئی خاص احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے مسوڑوں کی مالش ہو رہی ہے۔

کینیڈا کی البرٹا یونیورسٹی میں ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ نیا دانت اگانے کی یہ تحقیق پہلے خرگوش اور پھر انسانوں پر کی گئی اور کامیاب رہی۔"

بیگ صاحب نے بھنا کر کہا "میاں صاحب زادے! میں یہ سب کچھ پڑھ چکا ہوں۔ کیوں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ——" ایک مرتبہ پھر سیلزمین پر ہنسی کا دورہ پڑا اور اس نے بات پوری کی "میرے بزرگ ... ہی ہی ہی —— یہ تو بچوں کے ایک دو دانت اگانے کے لئے ہے۔ جن کی جڑیں ابھی زندہ ہوں۔ ہاہاہا —— نہ کہ بڈھوں کی پوری بتیسی اگانے کے لئے —— ہی ہی ہی۔"

بیگ صاحب چھڑی کے سہارے تیزی سے اٹھے اور لاحول پڑھتے ہوئے ایجنسی کے دفتر سے باہر آ گئے۔ گھر پہنچ کر کمرے میں بتیسی تلاش کرنے لگے۔ اچانک خیال آیا کہ وہ تو کریم کو دے دی تھی۔ پیچھے ہی کریم آیا۔ بیگ صاحب نے سوال کیا "کریمو وہ بتیسی کیا ہوئی؟"

کریم نے قریب آتے ہوئے کہا "میاں جی! وہ تو دندان ساز کو دی تھی کہ اسے میرے منہ میں فٹ کر دے۔ کم بخت نے اسے گھس گھس کر آدھا کر دیا لیکن کچھ کام نہ بنا۔ میاں جی! ایمان سے میرے لئے تو بس نئی بتیسی لگوا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

بیگ صاحب نے آلہ بنانے والی کمپنی کا سارا غصہ کریم پر نکالا "دفع ہو جا یہاں سے —— اتنی قیمتی مشین بے کار گئی۔ اس منحوس دندان ساز نے میری بتیسی کا ستیاناس مار دیا اور اب تو کہہ رہا ہے کہ تجھے نئی بتیسی لگوا دوں۔ کل کہے گا میرے منہ میں سونے کے دانت لگوا دیں۔ کم بخت کو اتنی جلدی تھی میری بتیسی لینے کی۔ خود بھی پوپلا رہا اور مجھے بھی پریشان کر دیا۔"

بیگ صاحب کریم پر برس رہے تھے کہ کھڑکی میں سے دو بچوں کے ہنسنے کی آواز آئی اور پھر ایک بچے نے زور سے کہا "دادا جان! وہ آلہ ہمیں دے دیں۔ ہم دونوں ڈاکٹر ڈاکٹر کھیلیں گے اور اپنے دوستوں کے دانت اگائیں گے۔ ہاہاہا —— ہی ہی ہی ——"

بیگ صاحب نے غصے میں زور سے کھڑکی بند کی اور بڑبڑائے "اللہ اس نئی نسل سے محفوظ رکھے۔"

کچھ دیر بعد بیگ صاحب بستر پر لیٹ گئے اور اپنے منصوبے کی ناکامی پر غور کرنے لگے۔ اچانک خیال آیا "لو رمضان ختم ہونے کو ہے اور عید میں ہفتہ بھر باقی ہے۔ اتنی جلدی تو نئی بتیسی بن نہ سکے گی۔ نہ تو عید پر کھانے پینے کا مزا آئے گا اور نہ پوپلے منہ سے بولتے ہوئے اچھا لگے گا۔ اب کیا کریں؟"

بیگم کمرے میں آئیں تو بیگ صاحب نے دل کڑا کر کے ان سے سارا ماجرا بیان کیا لیکن ہمدردی کے بجائے بیگم نے قہقہے لگائے اور بولیں۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ تو سویوں والی عید ہے۔ بقر عید تھوڑا ہی ہے۔ سویوں کا مزا تو پوپلے منہ میں زیادہ آئے گا۔ ویسے وہ کچوری سے تو زیادہ ہی نرم ہوں گی —— ہاہاہا"

☆☆☆

خوف کا سایہ

سائرہ کامران

فلیٹ پلازہ کے نیچے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا ۔۔۔ پولیس کی جیپ اور ایمبولینس پہنچ چکی تھی۔ پولیس کے جوانوں کے بھاری بھاری بوٹوں کی دھمک سے جیسے ایک پل کو سناٹا چھا گیا۔ لوگ سہم سہم کر ایک طرف ہٹنے لگے۔ پولیس فلیٹ نمبر 14 میں داخل ہوئی۔ یہ ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ ایک ایک چیز سے امارت ٹپک رہی تھی ۔۔۔ اور اس شاندار فلیٹ کی مالکہ بے حس و حرکت قالین پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے ان کے سر پر عقب سے وار کیا تھا اور بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی تھیں۔ ان کا نام بیگم یاسمین اور عمر 60 سال کے لگ بھگ تھی۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہنے والی بیگم یاسمین کو شاید کم ہی لوگوں نے غصے میں دیکھا ہوگا لیکن سنا ہے کہ جب کبھی وہ غصے میں آ جاتی تھیں تو ان کو قابو کرنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا لیکن ایسے مرحلے شاذ و نادر ہی آتے تھے۔

گزشتہ صبح ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ اپنے اکلوتے چار سالہ پوتے مانی کو اسکول چھوڑنے گئیں۔ مانی کے والدین کا انتقال پچھلے سال ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہو گیا تھا۔ بیگم یاسمین تبھی سے مانی کو اپنے کلیجے سے لگائے پھرتی تھیں۔ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر ایسے تڑپ اٹھتی تھیں جیسے اگر انہوں نے بروقت مانی کی تکلیف دور نہ کی تو قیامت آ جائے گی۔ اس دن اسکول میں مانی کی ٹیچر نے کسی بات پر اس کی تھوڑی بہت سرزنش کر دی تھی۔ یہ بات بیگم یاسمین کو کہاں ہضم ہوتی۔ انہوں نے جیسے ہی ٹیچر کی تیوری پر بل دیکھے تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئیں۔ انہوں نے قریب رکھا گلدان اٹھا کر ٹیچر کے سر پہ دے مارا۔ ٹیچر بے چاری تو خوف زدہ ہو کر بھاگی۔ آس پاس کے لوگوں نے بیگم یاسمین کو قابو کیا۔ لیکن وہ کہاں کسی کی سنتی تھیں۔ اس عمر میں بھی ان کے ہاتھ پاؤں خاصے مضبوط تھے۔ آخر پرنسپل صاحب موقع پر پہنچ گئے اور معاملے کو رفع دفع کر دیا اور بیگم یاسمین کے اس رویے کو ان کی ضعیف العمر دیوانگی سمجھ کر نظرانداز کر دیا پڑا۔ لیکن مانی کی ٹیچر کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے بیگم یاسمین کو دور اسٹاف روم میں کھڑی گھور رہی تھی۔ سکول میں موجود ڈاکٹر ٹیچر کے زخم کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم یاسمین جب اپنی اضطراری حالت سے باہر آئیں تو بڑی نادم ہوئیں۔ اسی وقت نجانے بازار سے کتنے پھول اور پھل لے کر ٹیچر کے پاس اسٹاف روم میں پہنچیں، لیکن تب تک ٹیچر گھر جا چکی تھی۔ بیگم یاسمین نے اسکول کے چپڑاسی کو پیسے دے کر ہدایت کی کہ یہ سامان مذکورہ ٹیچر تک پہنچا دے اور وہ کل خود اس سے معافی مانگیں گی اور اس کی خیریت بھی دریافت کریں گی۔ لیکن کل کس نے دیکھی آج صبح نو بجے کام والی نے جیسے ہی فلیٹ کا

دروازہ دھڑ دھڑایا تو دروازہ اپنے آپ ہی کھل گیا اور سامنے بیڈ روم کے اوپر بیگم یاسمین مردہ حالت میں پڑی تھیں۔ اس دن چھٹی تھی اس لیے ان کا پوتا بھی دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ لیکن وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ کوئی لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہا تھا۔ پولیس نے تمام کارروائی جلدی جلدی مکمل کی کیونکہ انسپکٹر خورشید نہیں چاہتے تھے کہ بات اور زیادہ بڑھے۔ فلیٹ کے اردگرد رہنے والوں کو گزشتہ روز کے اسکول کے واقعے کا علم تھا۔ بیگم یاسمین نے ہی انہیں آکر بتایا تھا وہ اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی اپنے ہمسایوں کو شریک کرتی تھیں۔ اس لیے پولیس کا پہلا شک ٹیچر ارم پر ہی گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی پولیس کی گاڑی ٹیچر ارم کے دروازے پر کھڑی تھی اور ٹیچر ارم سر پر پلو باندھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے لیڈی پولیس کو دیکھ رہی تھیں جو ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"رمشا ...... رمشا ...... میری امی ایسا ہرگز نہیں کرسکتیں۔ تم تو جانتی ہو نا۔" ٹیچر ارم کی بیٹی صدف روہانسی آواز میں فون پر رمشا کو اس صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ صدف کے ابو سعودی عرب میں رہتے تھے اور ابھی ایک ماہ کی چھٹیاں گزار کر واپس روانہ ہوئے تھے۔ گھر میں صدف کی بوڑھی دادی اور امی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ پولیس کے پاس ان کے خلاف جو تھوڑے بہت شواہد تھے وہ یہ تھے کہ صبح سات بجے ٹیچر ارم قریبی میڈیکل سٹور سے دوا لانے کے لیے نکلی تھیں اور کوئی دو تین گھنٹے بعد واپس آئی تھیں۔ وہ دو گھنٹے کہاں رہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق میڈیکل سٹور بند تھا اس لیے وہ بس میں سوار ہو کر ہسپتال پہنچیں تاکہ وہاں کے میڈیکل سٹور سے دوا لے سکیں۔ ساری رات ان کو سر کی تکلیف نے سونے نہیں دیا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ جلد سے جلد دوائیں لے کر چھٹی کے دن کچھ دیر آرام کر لیں لیکن بدقسمتی سے ہسپتال کے میڈیکل سٹور میں بھی مذکورہ دوائی نہ مل سکی۔ جو اسکول کے ڈاکٹر نے ان کو ہدایت کی تھی اور یوں وہ مایوس ہو کر گھر واپس آئی ہی تھیں کہ پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لے لیا تھا۔

"میں تمہاری امی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت صابر اور بلند اخلاق کی مالک ہیں۔ وہ ایسے بھیانک جرم کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم فکر نہ کرو میں ابھی تمہاری طرف آتی ہوں۔"

رمشا نے صدف کو فون پر تسلی دی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں اور نہ صرف ایک دوسرے کو بلکہ ایک دوسرے کے گھر والوں کو بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ رمشا کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ آنٹی ارم ایسا نہیں کرسکتیں لیکن حالات کچھ عجیب سے نظر آ رہے تھے۔ اس نے امی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور ان کی اجازت سے ابو کے ساتھ آنٹی ارم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

صدف نے رو رو کر اپنا حال برا کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے بات ہی ایسی تھی، اس کے تو ابو بھی بیرون ملک تھے اور ادھر لوگ پولیس کو دیکھ لیں تو تماشہ دیکھنے کے لیے تو ضرور کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا اور ایسی ہی ستم ظریفی کا شکار اس وقت صدف اور اس کے گھر والے نظر آ رہے تھے۔ رمشا جو کچھ صدف سے معلوم کرسکتی تھی اس نے کرنے کی کوشش کی لیکن حالات کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھے۔ آنٹی ارم اگرچہ ٹھنڈے مزاج کی خاتون ضرور تھیں لیکن بیگم یاسمین کی اس اچانک بے سروپا حرکت نے انہیں چڑچڑا کر رکھا تھا اور اس پر سردرد نے ان کو الگ ہلکان کیا ہوا تھا۔ لیکن اتنی صبح صبح دوائی کے لیے نکل جانا بھی کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ رمشا نے وہیں سے انسپکٹر خورشید کو فون کیا اور تھانے آنے کی اجازت چاہی۔ آدھے گھنٹے بعد رمشا انسپکٹر خورشید کے سامنے بیٹھی کیس کو اسٹڈی کر رہی تھی۔

"چونکنے والی بات یہ ہے کہ میڈم ارم نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔" انسپکٹر خورشید نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔" رمشا نے الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"فلیٹ کے اردگرد کے لوگوں نے دیکھا کہ صبح کی سیر پر جانے والی بیگم یاسمین جب واپس آئیں تو ان کے ساتھ تیس پینتیس سالہ ایک خاتون بھی تھیں۔ جو کچھ دیر کے بعد ان کے فلیٹ سے نکلی اور نیچے آکر رکشہ پکڑا اور جب ہم نے اس خاتون یعنی میڈم ارم سے اس بارے میں پوچھا تو وہ صاف مکر گئیں۔ یہ بات ہمارے شک کو تقویت دیتی ہے۔" انسپکٹر خورشید نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"کیا میں میڈم ارم سے مل سکتی ہوں ـــ" رمشا کی

فوراً حوالات میں ڈال دو۔" یہ کہتے ہی انسپکٹر خورشید نے

"ہاں کیوں نہیں"

اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ رمشاہ کو میڈم ارم تک لے جائے۔

"آپ نے جھوٹ کیوں بولا آنٹی۔" رمشاہ نے بلکتی ہوئی آنٹی ارم کے گلے لگتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے پاس چند روز سے بیٹھی تھی۔

"بس میں گھبرا گئی تھی اور پھر عقل پر پتھر پڑتے کتنی دیر لگتی ہے۔ جب میں ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ بیگم یاسمین ہاتھ میں تسبیح لیے جو گر پہنے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی صبح کی سیر کرتی نظر آئیں۔ مجھے کل کے واقعے پر شدید غصہ تھا اس لیے میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ لیکن وہ کمال محبت سے مجھ سے لپٹ گئیں اور معافیاں مانگنے لگیں۔ انہوں نے کچھ ایسے پیار سے مجھے گھیرا کہ میں واقعی چند لمحوں میں ہی اپنا سارا غصہ بھول گئی۔ انہوں نے کہا کہ جو دوائی مجھے چاہیے وہ ان کے فرسٹ ایڈ باکس میں ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے چائے کی دعوت بھی دے ڈالی اور اتنے اصرار سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی۔ میں ان کے ساتھ ہی چل پڑی چند قدم کے فاصلے پر ان کا گھر تھا میں ان کے ساتھ چند روز میں مست رہی۔ وہ اپنے قیمتی نوادرات میں شامل مختلف ڈیکوریشن پیس مجھے دکھاتی رہیں۔ اس دوران میں نے چائے پی اور دوائی لے کر ان کے فلیٹ سے بہت ہی خوبصورت یادیں لے کر نکل آئی۔ رکشہ لیا اور گھر پہنچی گھر میں ابھی سب سو رہے تھے۔ میں بھی لیٹ گئی ابھی آنکھ ہی لگی تھی کہ پولیس نے بدقسمتی بن کر دروازے پر دستک دے دی۔ اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں نے تم سے ایک لفظ بھی غلط نہیں بولا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں رمشاہ بالکل بے گناہ ___ میں نے تو آج تک چیونٹی بھی نہیں ماری۔ ایک جیتی جاگتی عورت کا قتل تو سوچ کر بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔" آنٹی ارم نے روتے روتے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں آنٹی مجھے تھوڑا وقت دیں۔ خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" رمشاہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا لیکن اس کا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ لگ رہا ہے وہ انہی سوچوں میں غلطاں ایک دفعہ پھر انسپکٹر خورشید کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور مزید معلومات حاصل کرنے لگی۔

"بیگم یاسمین کا پوتا مانی اس وقت کہاں ہے۔" رمشاہ نے اچانک سوال کر ڈالا۔

"وہ اپنی ایک ہمسائی آنٹی کے پاس ہے۔ لگتا ہے بیگم یاسمین کا

ہی کوئی نہ کوئی قریبی رشتے دار اس شہر میں نہیں، وقت بچے کے
پال سکا تو ٹھیک ورنہ یتیم خانے میں رہتے ہیں وہ ایک دو دن میں یہاں آ
جائیں گے۔ اگر بچہ ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔" انسپکٹر خورشید
نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
"مجھے مانی سے ملنا ہے۔" رمشاہ کسی خیال کے تحت بولی
اور کرسی سے کھڑی ہو گئی۔
"ٹھیک ہی کرتی ہو، ضرور ملو۔ لیکن وہ بچہ اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ تمہاری
بات بھی نہیں کر سکتا۔ اگر بھی تم اپنی تسلی ضرور کرو۔ شام تک ڈاکٹر
پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی آ جائے گی۔ وہ گلدان جس سے بیگم
... کے سر پر وار کیا گیا ہے نہایت وزنی دھات کا تھا۔ جس کے
ایک ہی وار نے ان کا کام تمام کر دیا مجھے لگتا ہے کہ اس پر پائے گئے
انگلیوں کے نشانات ہی ہمیں اس قاتل تک لے جائیں گے۔"
انسپکٹر خورشید نے کچھ ایسے یقین سے یہ بات کہی کہ جیسے انہیں
پورا یقین ہو کہ اس پر آنٹی ارم کے ہی انگلیوں کے نشانات ہوں
گے اور رمشاہ الجھ گئی۔
رمشاہ دو دن سے مسلسل مانی کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔
یہ اس کی محبت اور محنت ہی تھی کہ مانی بہت جلد اس کے ساتھ
بے تکلف ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ کسی کو بھی اپنے پاس نہیں
آنے دے رہا تھا۔ جو بھی اس کے قریب آتا وہ "نونو، نونو" کہہ کر
اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتا۔ مانی دراصل پانی کے بچے کو نونو کہتا
تھا اس کا حلق خوف سے اتنا خشک ہو جاتا تھا کہ بار بار اسے پیاس
لگتی تھی۔ لیکن جیسے ہی کوئی پانی اس کی طرف لے کر بڑھتا وہ
خوفزدہ ہو کر گلاس دور پھینک دیتا۔
"مانی ایک بات بتاؤ اس دن تمہاری ٹیچر جب تمہارے گھر
آئیں تو تم نے ان سے بات کی تھی؟" رمشاہ مانی کے بالوں میں
ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ مانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "تم نے پھر
کس کو فلیٹ میں آتے دیکھا تھا۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے۔" رمشاہ
نے پُرامید نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ مانی کی آنکھیں
پھیلتی چلی گئیں۔ خوف اور دہشت نے اس کا رنگ سفید کر دیا اور وہ
گہری آواز میں بولا "نونو... آنٹی نونو آیا تھا" اور یہ کہتے ہوئے وہ
رمشاہ سے لپٹ گیا۔ رمشاہ نے خوفزدہ بچے کو دیکھا اور محبت سے
اسے گلے لگا لیا۔ لیکن اچانک وہ چونک اٹھی یہ خیال اسے پہلے کیوں
نہیں آیا؟؟ وہ اپنے آپ سے بچے کو جدا کر کے فوراً ٹیلیفون کی
طرف لپکی اور انسپکٹر خورشید کا نمبر ملانے لگی۔
وہ تین گھنٹوں بعد رمشاہ مانی کو لے کر تھانے میں بیٹھی تھی
سامنے ایک کیم شحیم آدمی کھڑا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس کے
ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی لیکن چہرے پر کسی ندامت کے آثار نہیں تھے
"اچھا تو تم ہو وہ "نونو" انسپکٹر خورشید کمرے میں داخل
ہوتے ہوئے بولے۔
"تمہاری اس خاتون کے ساتھ کیا دشمنی تھی تم تو وہاں اکثر
نلکے کے پائپ ٹھیک کرنے جاتے تھے۔ تمہاری تو انہیں خاصی ٹھیک
ٹھاک تھی مزدوری سے پھر تم نے یہ گھناؤنا جرم کیوں کیا۔" انسپکٹر
خورشید نے درشت لہجے میں کہا۔
"انسپکٹر جی... مجھے تو اس کاکے کا پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ
مجھے کہاں سے دیکھ رہا ہے ورنہ آپ تو آج میری گرد کو بھی نہ پا
سکتے خیر جو قسمت کو منظور میرا ابھی کوئی کام کر کے نہیں پچھتایا۔ اس
اس دن جب اس کے گھر نلکے کا پائپ ٹھیک کرنے گیا تو اس نے
پیسے ہی مزدوری کے لیے پرس کھولا سامنے ہزار ہزار کے نوٹ دیکھ
کر ایمان ڈول گیا۔ لاؤنج میں آ کر پاس رکھا گلدان اٹھا کر دے مارا اور
پیسے اٹھا کر چلتا بنا مجھے معلوم تھا چھٹی کا دن ہے اس لیے کوئی مجھے
نہیں دیکھ سکتا۔ میں گھر کے پچھواڑے ایمرجنسی کے لیے لگائی گئی
سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ نہ کسی نے آتے دیکھا نہ جاتے انگلیوں
کے نشانوں کا کیا تھا آپ کا تو دھیان بھی میری طرف نہ جاتا۔ پر
رب دی ذات بڑی نرالی ہے۔ مجھ سے قتل کروا دیا اور اس
چھوٹے سے کاکے نے مجھے پکڑوا دیا۔ اب اور کیا پوچھو گے؟" وہ
ابھی بھی کسی فلمی ولن کی طرح سے مسکرا کر بولا۔
"تم جیسے لوگ ہی انسانیت کے نام پر دھبہ ہو... اگر میرا
ذہن کام نہ کرتا تو تمہاری وجہ سے مانی کی تو زندگی برباد ہوئی ہی
ہوئی میری سہیلی کا گھر بھی اجڑ جاتا۔" رمشاہ نے نفرت سے نونو
کو دیکھتے ہوئے کہا۔
آنٹی ارم... اب آزاد تھیں اور صدف ان سے لپٹ کر
ایسے رو رہی تھی جیسے صدیوں بعد ان سے ملی ہو۔

پروفیسر: (نوکر سے) "جاؤ ایک خالی رکشہ لے کر آؤ۔"
نوکر: بہت دیر کے بعد واپس آ کر کہنے لگا "صاحب کوئی رکشہ خالی نہیں ملا۔"
پروفیسر نے پوچھا: "وہ کیوں؟"
نوکر نے جواب دیا: "صاحب مسئلہ یہ ہے کہ ہر رکشے میں ایک آدمی ضرور بیٹھا ہوتا ہے۔" (عاطرہ شفقت، ساہیوال)

استاد (طالب سے): "اگر سورج دن کے ساتھ رات کو بھی نکلے تو کیا ہوگا؟"
طالب: "سر! بہت مزہ ہوگا، دن کے ساتھ رات کو بھی سکول لگے گا۔" (نگار زہرہ، راولپنڈی)

ایک دوست: "میرے ابو میں بڑی خوبیاں ہیں۔ بہادر ایسے جیسے شیر، تندرست ایسے جیسے ہاتھی، اور آنکھیں عقاب کی طرح تیز ہیں۔"
دوسرا دوست: "اگر تمہارے ابو کو دیکھنا چاہیں تو کتنے کا ٹکٹ لینا ہو گا۔" (عائشہ شفقت، ساہیوال)

ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی کہ ایک بوڑھی عورت نے جلدی سے زنجیر کھینچ دی۔ گاڑی کھڑی ہو گئی تو گارڈ نے آ کر پوچھا کیا وجہ ہے۔ بوڑھی عورت بولی: "بیٹا گاڑی آہستہ چلاؤ کہیں میری ٹوکری میں رکھے ہوئے انڈے نہ ٹوٹ جائیں۔" (وحید احمد، لاہور)

گڈو میاں اپنی خالہ کے ہاں دعوت میں گئے۔ کھانا کھا چکے تو خالہ نے کہا: "بیٹا شرماؤ مت اور کھاؤ۔"
گڈو میاں بولے: "بس خالہ جان، منہ تک پیٹ بھر گیا ہے، اب جگہ نہیں ہے۔"
خالہ بولیں: "اچھا تو یہ تھوڑے سے انگور جیب میں رکھ لو۔"
گڈو میاں بولے: "شکریہ، خالہ جان، جیبیں بھی منہ تک بھری ہوئی ہیں۔" (سنبل اشرف، گوجرانوالہ)

ایک شخص سائن بورڈ بنانے کے لیے پینٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ سائن بورڈ پر یہ عبارت لکھنا: "ضمیر الدین کتب فروش۔"
دوسرے دن وہ سائن بورڈ لینے گیا تو اس پر لکھا تھا: "کتب الدین ضمیر فروش۔" (خالد آفریدی، ملتان)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): "میرے ابو اپنے بچپن میں ہمیشہ ریاضی کے پیریڈ میں کلاس میں سب سے پہلے آیا کرتے تھے۔"
دوسرا دوست: "مگر تمہارے ابو تو تین سال برابر ریاضی میں فیل ہوتے رہے۔ پھر وہ پہلے کیوں آتے تھے۔"
پہلا دوست: "آخری بنچ پر بیٹھنے کے لیے۔" (سرمد علی کاظمی، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

ایک کنجوس پروفیسر نے جیب سے روپیہ نکالتے ہوئے لڑکوں سے کہا "میں اسے تیزاب سے بھرے گلاس میں ڈال رہا ہوں کیا یہ اس میں حل ہو جائے گا۔"
ایک لڑکا بولا: "بالکل نہیں۔"
پروفیسر: "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
لڑکا: "اس لیے کہ اگر یہ تیزاب میں حل ہو جاتا تو آپ اسے ہرگز تیزاب میں نہ ڈالتے۔" (محمد شیراز، اوکاڑہ)

کھوج لگائیے!

نذیر اور کبیر شکار کے لیے جنگل میں گئے۔ انھوں نے وہاں ایک خیمہ لگایا اور شام کو کھانا پکانے کے لیے ایک اسٹوو جلا لیا۔ اچانک نذیر کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ اس نے افراتفری میں باہر بھاگنا چاہا تو کبیر نے اسے دھکا دے کر گرا دیا اور خود باہر چلا گیا۔ بتائیں اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور کیا نذیر کی جان بچ گئی؟

اکتوبر 2006ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے!" کا صحیح حل: سلیم اور ارسلان نے ویڈیو کیسٹس توڑ کر ان کے فیتے بطور رسی استعمال کرتے ہوئے بوتل کو باندھا اور اسے کنویں میں لٹکا کر پانی حاصل کیا۔

یہ جواب اس دفعہ بہت زیادہ بچوں نے ارسال کیا، جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50، 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

(1) محمد نعیم، راولپنڈی (2) رانا محمد عرفان، ملتان (3) تصور عباس، چکوال (4) سدرہ سلیم، کراچی (5) شاہین شاہد، لاہور (6) ثنا حمید، بہاولنگر (7) ماریہ شفقت، ساہیوال (8) فریحہ پیرزادہ، واہ کینٹ (9) جواد ریاض، پشاور (10) ارسلان خان، نوشہرہ۔

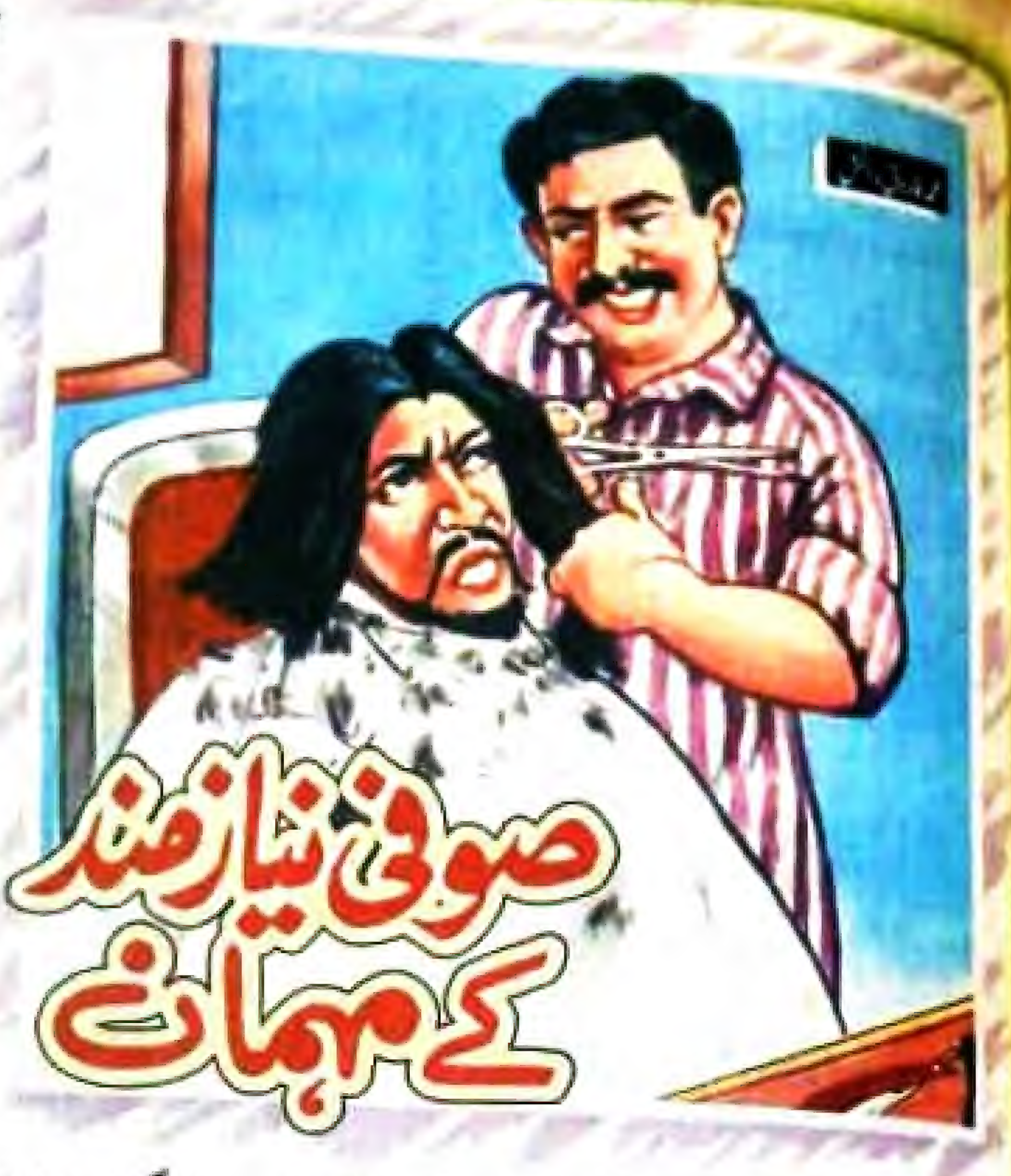

صوفی نیازمند کے مہمان

صوفی نیازمند اس وقت بال بنوانے میں مصروف تھے۔ عید کی آمد آمد تھی جس کے باعث صوفی صاحب کی تیاریاں بھی عروج پر تھیں۔ قینچی کے ساتھ ساتھ حجام کی زبان بھی چل رہی تھی۔ صوفی صاحب کو بال بنواتے وقت بات چیت کا کوئی خاص شوق نہ تھا لیکن وہ حجام کی زبان روکنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ تین چار دکانیں انہوں نے محض اس لیے تبدیل کی تھیں کہ شاید کوئی تو ایسا ہو جو کم بولتا ہو لیکن اب تک ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ حجام کے نرخوں میں تو کمی بیشی انھیں نظر آئی لیکن بات چیت سے پرہیز کرنے والا کوئی شخص انھیں نہ مل سکا۔ وہ بہرحال مجبور تھے۔

"صوفی صاحب! آپ عید یہیں منائیں گے یا سسرال جائیں گے؟" اس نے ان کے سر پر پانی کا فوارہ چھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

"...میاں! میں تو اپنے گھر پر ہی عید منانے کا قائل ہوں۔" صوفی صاحب نے گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"آپ چاہے اپنے گھر پر عید منائیں مگر میں تو سسرال جاؤں گا۔" حجام نے ان کے بالوں کی لمبی لٹ پر تیزی سے قینچی چلاتے ہوئے کہا۔ "سسرال میں عید گزارنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ خرچ بھی کوئی نہیں، اور مال بھی مزے مزے کا۔" وہ اپنے حریص پن کا کھلا اظہار کر رہا تھا۔

"تم سسرال جاتے ہو تو جاؤ، مجھے کیا؟" انھوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میرے بال صحیح طرح کاٹو۔"

"صوفی صاحب! بال تو میں ایسے بناؤں گا کہ آپ آئینہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔" وہ اپنی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

"دیکھ لیں گے۔" انھوں نے اپنی ناگواری برقرار رکھی۔

"صوفی صاحب! آپ کو معلوم ہے چینی کی قیمت کتنی اوپر جا رہی ہے۔" حجام نے ان کا خط بنانا شروع کرتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ہاں بھئی! اس چینی کے ہاتھوں تو سب ہی پریشان ہیں۔" صوفی صاحب نے بھی اپنی پریشانی کا برملا اظہار کیا۔

"آپ کبھی یوٹیلیٹی اسٹور گئے ہیں؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"گیا تو کبھی نہیں مگر اس کے باہر سے ضرور گزرا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"آپ سے ملاقات بھی ہے ... " انھوں نے
... بولا تھا۔
"جی ..."
"آپ کو پتا ہے شہر کی ... کے چکر لگا رہا
ہوں۔" وہ غصے سے بولا۔
"مجھے کیا معلوم ... آپ کی بات ... رہے
سوائش تھے۔"
"میں 25 برس کا ہو رہا ہوں صوفی صاحب۔" وہ کہتے
ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ
ان 25 برسوں کے بعد بھی میں ایک قلم بھی حاصل نہ کر سکا۔"
"مجھے تمھاری حالت پر افسوس ہے۔"
"آپ صرف افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔" اس کے لہجے
کے ساتھ نفرت ... "ان اسکولوں سے پرچون
اور ... کو شریک ... ہے صوفی صاحب۔" اس کا لہجہ مزید سخت
ہوگیا۔ "میں ان کے خلاف کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"
"ارے میاں چھوڑو۔" صوفی صاحب نے اس کے ہاتھ کو
دبانے کی کوشش کی۔ "تم شہرت کے حصول کے لیے جو چاہو
کرو ... تو مت کالو۔" وہ غصے سے بولے۔
"آپ نے خوب فکر کی صوفی صاحب۔" وہ جیسے ہوش میں
آتا ہوا بے پروائی سے بولا۔ "میرے پاس زخم بند کرنے کا پورا
بندوبست ہے خون ذرا اکٹھا کر لو تو دیکھے۔"
"تو کیا تم زخمی کرنے کے موڈ میں ہو۔" انھوں نے درمیان
سے اٹھنے کی کوشش کی۔
"آپ تو یوں ہی ... خواہ مخواہ ... ناراض ہو رہے ہیں۔"
وہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ملائمت اختیار کرتے ہوئے بولا۔
"بس چھوڑو۔ مجھے جانے دو۔"
"یہ لیں میں نے اپنا منہ سی لیا اور آپ کا خط بنا دیا۔" اس
کے بعد حجام نے خاموشی اختیار کرنے میں عافیت جانی اور صوفی
صاحب کا باقی ماندہ کام نمٹانے لگا۔ وہ ان کی بداخلاقی مول لے کر
ایک اور گاہک کم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔
"لیجیے صوفی صاحب ... بغیر آپ کا کام مکمل ہو گیا۔"
اس نے پشت سے انھیں آئینہ دکھاتے ہوئے کہا۔ انھوں نے

سکون کا سانس لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"25 روپے دے دیجیے صوفی صاحب!" اس نے باقاعدہ
ان سے پیسے طلب کیے۔
"کیا ... کیا ... یہ تو بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔"
"عید کا سیزن ہے۔ عیدی نہیں دیں گے کیا صوفی
صاحب؟" اس نے بھلا سا منہ کھولا۔
"کہاں میاں! عید میں تو کافی دن ہیں ابھی۔ عید آئی
تو ..." وہ بڑبڑاتے ہوئے جیب سے رقم نکالنے لگے۔ دس دس
کے تین نوٹ انھوں نے حجام کے حوالے کیے۔ وہ دراز سے
پانچ کا سکہ نکالنے لگا۔
"تمھارے ہاں داڑھی کے کتنے پیسے ہیں؟" انھوں نے
اچانک سوال کیا۔
"10 روپے صوفی صاحب۔" وہ ان کی طرف پشت کیے
ہوئے بولا۔
"اور خط بنانے کے ...؟"
"صرف چھ روپے لیتا ہوں۔" وہ اپنے کم ریٹوں پر فخریہ
لہجے میں بولا۔
"ان دنوں عیدی کے کیا ریٹ ہیں تمھارے؟"
"صرف پانچ روپے کی ... لے رہا ہوں صاحب۔" وہ پانچ
کا سکہ انھیں تھماتے ہوئے بولا۔
"دس اور چھ سولہ" اور پانچ ... "ارے میاں! تمھارے اپنے
حساب سے 21 روپے بن رہے ہیں پھر تم 25 روپے کیوں لے
رہے ہو؟"
"جی ایں ..." حجام اپنی بتائی ہوئی تفصیل میں الجھ گیا
تھا۔
"نہیں میاں یہ غلط بات ہے لاؤ نکالو چار روپے۔" انھوں
نے ہتھیلی آگے بڑھائی۔
"چھوڑیں صوفی صاحب! عید کا موقع ہے۔" وہ گڑگڑایا۔
"بھئی حساب ہوتا ہے وہ تو ہو چکا۔ اب جو بچا ہے وہ تو
تمھیں دینا ہی پڑے گا۔"
وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا لیکن وہ صوفی صاحب ہی
کیا جو کسی کی بات مان لیں۔ وہ اپنے چار روپے اس سے نکلوا کر

ہی رہے۔

بیگم صوفی صاحب کی کنجوسی پر دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئیں۔ انہیں ان سے ایسی امید نہ تھی۔ وہ کافی دیر تک اس بات پر پچھتاتی رہیں کہ اس نے حساب کی درست تفصیل بتائی ہی کیوں۔

صوفی صاحب باہر آ کر گھر کی جانب چل دیئے۔ دوست احباب راستے میں ملے لیکن روزہ کی حالت میں وہ ادھر ادھر رکنے کے عادی نہ تھے۔ اچانک گلی مڑتے ہوئے محلے کے کچرا کنڈی پر ایک عجیب منظر دیکھا اور اس پر وہ بے حد افسردہ ہو گئے۔

آج 29 واں روزہ تھا۔ صوفی صاحب عید کی خریداری کے حوالے سے بے حد مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کلن کو ساتھ لیا اور مختلف سامان بازار سے خرید کر اس کے ہاتھوں گھر پہنچوانے لگے۔

شام چار بجے جب وہ سامان کی آخری کھیپ لے کر گھر میں داخل ہوئے تو بیگم نیاز مند ان سے سوال کر بیٹھیں۔

"آپ کی اس قدر تیاری ..... میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"کیوں بیگم؟" وہ اپنی پھندنے والی ٹوپی ہلاتے ہوئے بولے "کل عید ہو سکتی ہے، اس کی تیاری بھی تو کرنا ہے نا؟"

"تیاری تو ضروری ہے مگر اس بار تو آپ نے عید کے روز بھی یار دوست کی گھر پر دعوت نہیں رکھی۔"

"ہاں بالکل!"

"نہ ہی میرے بھائی صاحب اس عید پر آئیں گے، نہ چچا نہ ماموں....." وہ کہہ رہی تھیں۔

"آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں بیگم!" صوفی صاحب انتہائی سادگی سے بولے۔

"تو پھر یہ دس کلو مرغی، بارہ کلو چاول، پانچ کلو فروٹ، چودہ کیک، بکری کے اتنے سارے لوازمات ..... آخر یہ کون کھائے گا؟"

"عید کے دن ہمارے ہاں بہت خاص مہمان آئیں گے، یہ سارے لوازمات ان ہی کے لیے ہیں۔" وہ سرشاری کے عالم میں بولے "بس آپ دس پندرہ افراد کے کھانے کا انتظام کر دیجیے گا۔"

"دس پندرہ افراد ..... کون ہیں وہ خاص مہمان کچھ پتا تو چلے کہ کون آ رہا ہے۔"

بیگم نیاز مند تجسس سے پوچھ رہی تھیں۔

"ابھی نہیں۔" وہ تجسس پیدا کرتے ہوئے بولے۔ "ان مہمانوں کو تو آپ اسی وقت پہچانیں گی جب گھر آئیں گے۔"

"میری سمجھ میں آپ کی یہ فضول خرچی نہیں آ رہی۔" وہ ابھی تک پریشان تھیں۔

"بیگم! یہ فضول خرچی نہیں، فراخ دلی ہے۔" وہ خوش دلی سے بولے۔ "آپ تو صرف اتنا بتایئے کہ میری اس دعوت کا اہتمام کریں گی یا....."

"اب تو آپ سامان لے ہی آئے ہیں تو کرنا تو پڑے گا کچھ نہ کچھ....." وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"بہت بہت شکریہ!" وہ بے حد خوشی کے ساتھ بولے۔

صوفی صاحب رقم خرچ کرنے کے معاملے میں اگر کنجوس نہ تھے تو کچھ زیادہ فیاض بھی نہ تھے۔ رقم کو کفایت سے خرچ کرنا ان کی عادت کا حصہ تھا۔ ہاں! یہ ضرور تھا کہ اگر ان کے دل میں کوئی خواہش مچل جاتی تو وہ بے سوچے سمجھے، چھوٹی یا بڑی ہر طرح کی رقم خرچ کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اس وقت انہیں لاکھ کوئی عقل کی بات سمجھاتا لیکن وہ ایسے ہو جاتے جیسے انہیں سمجھدار بننے سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

چاند رات کی مبارک ساعتیں سمیٹتے ہوئے صوفی نیاز مند عید کی صبح اٹھے اور عیدگاہ نماز پڑھنے چلے گئے۔ اپنے دوستوں سے ملاقات کے بعد جب وہ گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیگم ان مہمانوں کی خاطر مدارات کے انتظام میں لگی ہوئی تھیں۔

"بیگم! آپ کو بہت بہت عید مبارک ہو۔" وہ سیدھے کچن میں جا کھڑے ہوئے۔

"آپ کو بھی دلی عید مبارک ہو۔" ان کی بیگم نے کڑھائی میں رس ملائی ڈالتے ہوئے کہا۔

"ابی صاحب! مجھے تو عید کی مبارک باد دیجیے۔" کلن دروازے کی اوٹ سے بولا۔ وہ یہاں بیٹھا لہسن کاٹ رہا تھا۔

"ارے ہاں! کیوں نہیں، تمہیں بھی عید مبارک ہو۔ آؤ گلے مل لو۔" صوفی صاحب نے اسے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔

کلن نے جلدی سے میلے کپڑے سے لہسن والے ہاتھ

صوفی صاحب کے پاس آ کر صوفی صاحب
صاف بچ کر ایک طرف آنے لگے۔
نے اسے گلے سے لگایا اور
صوفی صاحب عیدی کا ... جیب سے لفافہ نکالا۔
عید مبارک ہو، خوش رہو۔ صوفی صاحب اس
کی طرف توجہ کرتے ہوئے بولے۔ "بچو! اس غریب کو عیدی
طرف سے 50 روپے عیدی کے طور پر دے دیجئے۔"
"تم ... عیدی ... اور وہ بھی 50
روپے"
"نہیں ... میں نے کچھ زیادہ کہہ دیا۔" وہ اسے چڑاتے
ہوئے بولے۔
"میں اس سے زیادہ عیدی لوں گا بس!" وہ روٹھ کر
بیٹھ گئی۔
"ارے ابھی پچھلی عید پر ہی تو تمہیں 100 روپے
عیدی دی تھی۔"
"وہ بھی تم عیدی تھی ..." اس نے احتجاج کیا۔ "اور یہ اس
سے بھی کم ہے۔ اگر اس بار مجھے 500 روپے عیدی نہ ملی تو میں تو
پھوڑ ... کروں گی۔" اس نے نخرے سے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔
"ہت ... تم ... بھی ... باتیں کرتے ہو بیٹا۔"
وہ شوکے گلے کی وکالت کرتے ہوئے بولے۔ "کیا تم آج کل ...
پڑھتے لگے ہو۔"
"آپ بات کو ادھر ادھر نہ گھمائیں۔ صرف میری عیدی کی
بات کریں۔" آج اس کا موڈ درست نہ تھا۔
"بچہ تھوڑی سی کر لو۔" وہ وارد کرنے لگے۔
"ہاں ہاں ... کیوں تنگ کر رہے ہیں اس بے چاری
کو۔" ان کی بیگم سے رہا نہ گیا تو درمیان میں مداخلت کر بیٹھیں۔
"چلو بھی دے دو انہیں 500 روپے، کیا یاد کرے گی۔"
دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولے۔
"چپ چپ ہو ..." یہ کہہ کر غلطی اس زور سے ایک کر
رکھی چائے کی پیالی پر ہاتھ مار بیٹھے۔ وہ تو شکر تھا کہ چائے ٹھنڈی
تھی لیکن وہ گرتے گرتے اس کے منہ پر ... کر گئی۔ صوفی
صاحب موقع کی
نزاکت سمجھ کر فوراً
اور وقت سے پہلے
ہو گئے تھے ورنہ ان
کی نئی شیروانی کا رنگ
ہی ... جاتا۔
"بس مل گئی ... تم
کو عیدی۔" بیگم
نیاز مند پیار بھرے
غصے سے بولیں۔
"وہ تو ... کیا
کروں ... خوشی
مجھے راس ہی نہیں
آتی۔" وہ بڑی انکساری
سے اپنے کرتے کو
دیکھتے ہوئے بولا۔
"چلو، اب جلدی

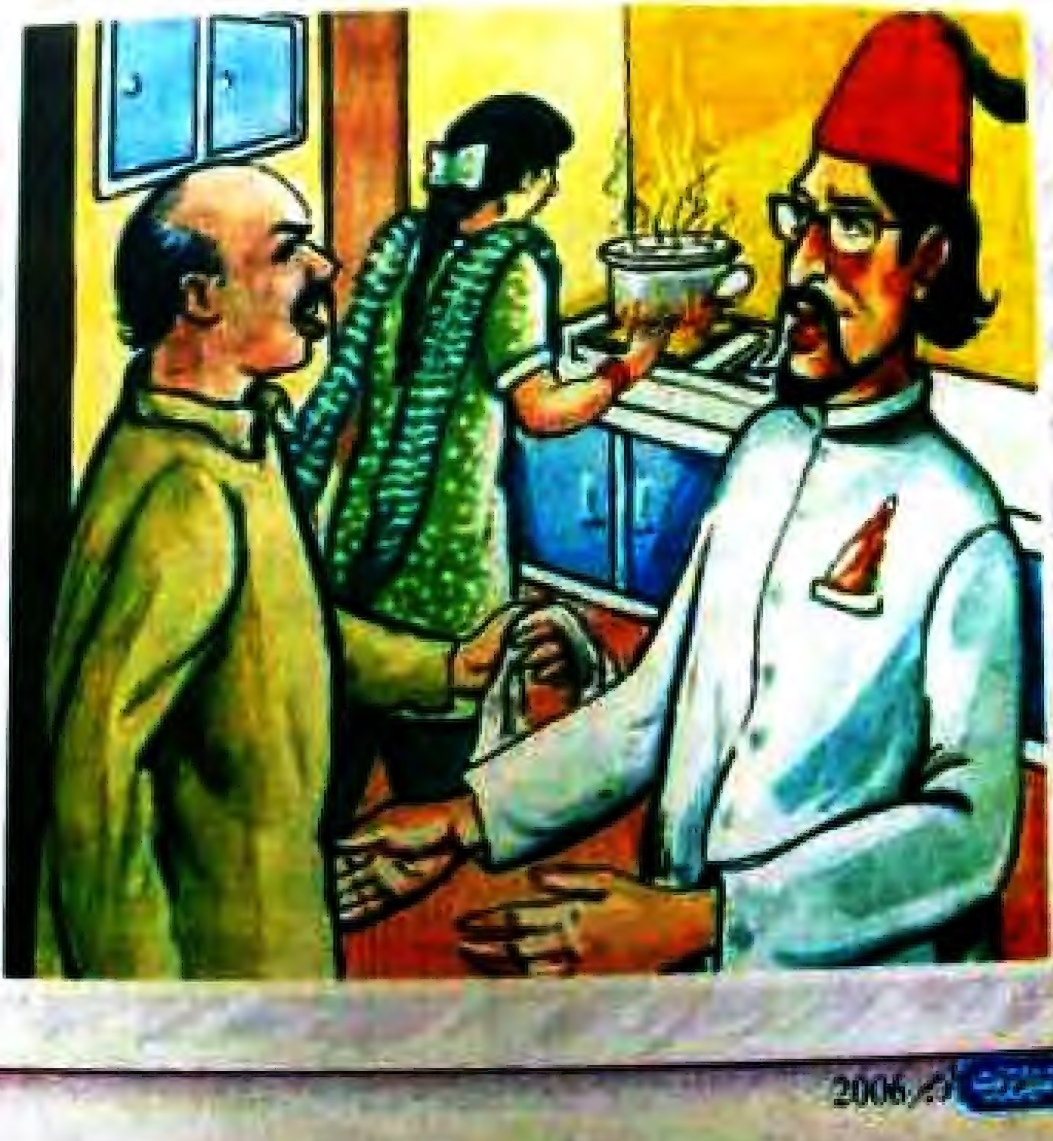

سے کچھ نہ تو لے کر
... مہمان آنے ہی
والے ہیں۔" صوفی
صاحب نے کہا اور
... دروازے کی طرف
بڑھ گئے۔ بکھری ہوئی
... گھنٹی کی آواز سنائی
... صوفی صاحب
... میں تھے
... فوراً
... کی
دروازے کی طرف
... وہاں ان
کے دوست چمن
... موجود تھے
صوفی صاحب نے ان
کی انوکھی مہمانوں کو
جمع کر کے لانے پر
... تھی۔

"میں مہمانوں کو لے آیا ہوں۔" چمن خان نے انہیں اطلاع دی۔

"کہاں ہیں، بلاؤ انہیں۔" صوفی صاحب خوشی سے بولے۔

"وہ رہے۔" یہ کہہ کر چمن خان پیچھے کی طرف مڑے اور انہوں نے مہمانوں کو اشارہ کیا۔ کوئی بارہ تیرہ بچے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس دروازے کے پاس آ گئے۔ صوفی صاحب نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب بلند آواز سے عید مبارک کہتے ہوئے اندر آ گئے۔ صوفی صاحب نے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا اور انہیں عید کی مبارک باد دی۔ بچے ان کے گھر آ کر بہت مسرت محسوس کر رہے تھے۔ وہ ادھر اُدھر اچھل کود کر رہے تھے۔ کوئی صوفے پر چڑھ رہا تھا تو کوئی کرسی کھینچ رہا تھا۔ کوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا تو کوئی کچن کی طرف نکل گیا۔

بیگم نیاز مند نے شور کی آوازیں سنیں تو کچن سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اتنے سارے ان جانے بچوں کو دیکھ کر وہ چونکیں۔

وہ تمیں بچے ان کی جانب آ چکے تھے۔ ان کی سمجھ میں صوفی صاحب کی یہ عجیب قسم کی مہمان داری نہیں آ رہی تھی۔ بچے ان سے ہیلو ہائے کر کے کچھ اور باتیں کرتے کہ صوفی صاحب نے انہیں بلا لیا۔ گلشن سے کہا کہ وہ جلدی سے کیک، نمکو، رس ملائی اور بسکٹس وغیرہ جلدی سے میز پر سجا دے۔ جب تمام لوازمات سج چکے تو بچوں کو کھانے کا اشارہ کیا۔ بیگم نیاز مند نے کیک کاٹنا شروع کیا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ بچے برسوں کے بھوکے ہوں۔ انہوں نے ہر طرح کے تکلفات کو بالائے طاق رکھا اور جس کے ہاتھ جو جس طرح آتا گیا، وہ کھاتا گیا۔ کسی نے کیک منہ میں ٹھونسا اور چپس مٹھی میں بھر لی، کوئی دونوں ہاتھوں میں دو دو چیزیں لیے اپنے پیٹ کو بھرنے میں مصروف تھا۔ کسی کو نمکو میں مزہ آ رہا تھا اور کوئی رس ملائی شربت میں ڈبو کر کھا رہا تھا۔

بیگم نیاز مند ان بچوں کی بے تکلفانہ حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں، انہوں نے بچوں کو روکنے ٹوکنے کی بھی

کوشش کی لیکن صوفی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر انہیں ان کے ساتھ بیٹھنے سے باز رکھا۔ بچوں نے بیگم کی ایسی تمام ہدایات کو بے صاف کر دیا ایک ایک بیان کر کی جگہ ٹال دیا تھا۔

وہ سمجھی ہوں گی کہ بیگم نیاز مند ملاقات کو نکل گئی ہیں۔ اب کو بھی چاروں طرف پھیلتا تھا۔ انہوں نے بچوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے سے مل کر دیکھا کس نسبت کی مہار، صوفی صاحب نے یہاں اکٹھا کر ڈالا ہے۔

ابھی وہ کچھ سوچ رہی تھیں کہ صوفی صاحب نے انہیں کھانا پیش کرنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ اٹھ کر چلے گئے اور ان کی غیر موجودگی میں حیران تھے کہ اتنے غریب غربا بچوں کو آخر صوفی صاحب نے اپنے ہاں کیوں مہمان بلایا ہے؟

صوفی صاحب نے بچوں کو دوپہر کا کھانا بھی خوب اچھے طریقے سے کھلایا۔ بچے مرغی، پلاؤ، کباب، زردہ اور بہت ساری اشیاء کھا کر بہت خوش ہوئے۔

"بچو! عید کے تینوں دن، تینوں وقت کھانا یہیں آ کر کھایا کرو۔" صوفی صاحب بچوں سے مخاطب تھے۔ "تمہیں تمہاری پسند کی ہر چیز کھانے کو ملے گی۔"

"جی انکل! میں تو رات کو قورمہ کھاؤں گا۔" ایک بچہ چلاتے ہوئے بولا۔

"میں تو بھنڈی شوق سے کھاتی ہوں۔" ایک لڑکی خوشی سے چلائی۔

"انکل! ہماری عیدی۔۔۔" ایک اور لڑکے نے کہا۔

"تم سب فکر مت کرو، ہر بچے کی ہر خواہش ضرور پوری ہو گی۔" صوفی صاحب خوش دلی سے بولے۔ ان کے ماتھے پر کوئی شکن تک نہ تھی۔

بیگم نیاز مند ان کی اس طرح سے اڑائی جانے والی چیزوں کو دیکھ کر جل گئی تھیں۔ انہیں ان بن بلائے مہمانوں سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ ایسے میں صوفی صاحب ان کے پاس آئے۔

"بیگم! آپ یقیناً ان بچوں کو دیکھ کر حیران پریشان ہوں گی۔" وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولے۔ "یہ وہ غریب بچے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ان میں سے کوئی بچہ کسی بیوہ کا ہے جو گھروں کے برتن دھو کر بابوؤں کے کپڑے سی کر اپنے یتیم بچوں کا پیٹ پالنے کی کوشش کرتی ہے تو کوئی بچہ ایسا ہے جو کسی گیراج پر سارا دن کام کرتا ہے اور صرف آخر میں تھوڑا سا صرف استاد کی گالیاں کھاتا ہے بلکہ بھوک کے وقت استاد کا جھوٹا کھا کر خوش رہتا ہے۔"

وہ جذباتی انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ "ان میں بعض بچے تو ایسے ہیں جو کچرے سے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں اور غربت کی حد تو یہ ہے کہ بھوک کے وقت یہ بچے اسی کچرے کے ڈھیر میں ہمارا پھینکا جانے والا رزق تلاش کر کے کھاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "ہم ہر رات کتنا کھانا باہر اچھال دیتے ہیں لیکن کتنی بار ہم نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے کبھی کسی بھوکے کو بلا کر کھانا کھلایا ہے۔" وہ دکھی دل کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ "اس لیے اس بار میں نے سوچا کہ یہ عید ان غریب بچوں کے نام کر دی جائے۔ ان کے تمام کپڑوں، عیدی اور کھانے پینے کے اخراجات ہمارے ذمے۔"

ان کی بیگم، صوفی صاحب کے جذبات سے واقف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بچوں کے پاس جا کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور مخاطب ہوئیں۔

"بچو! یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہارے انکل نے تو تمہیں تین دن کی دعوت پر بلایا ہے لیکن میرا تم سے یہ کہنا ہے کہ اگر کسی دن تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو اور تم ہمارے گھر کے نزدیک ہو تو پھر کسی کو بھی کچرے کے ڈھیر سے کھانا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، وہ بلا جھجک ہمارے گھر آ سکتا ہے۔"

ان کی آنکھوں سے بھی دو آنسو ٹپک پڑے۔ عید کی خوشیوں میں یہ آنسو انہیں بہت اچھے لگے تھے۔ صوفی صاحب کی جانب سے کیا جانے والا خرچہ انہیں ان ہنستے مسکراتے بچوں کی خوشیوں کے بدلے بہت معمولی لگ رہا تھا۔

★★★

آپ نے پوچھا؟

■ سیہ موت یا بلیک ڈیتھ سے کیا مراد ہے؟ ______ (شبیر ثاقب' راولپنڈی)

ج بلیک ڈیتھ بیماری، تیرہویں صدی میں طاعون کو کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بیماری یورپ میں لاکھوں اموات کا باعث بنی۔ چونکہ اس دور میں صفائی اور حفظان صحت کا معیار بہت ناقص تھا اس وجہ سے یہ بیماری چوہوں اور دوسرے جانوروں مثلاً کتوں، بلیوں سے انسانوں میں منتقل ہو جاتی۔

■ بال پوائنٹ کے موجد کا نام بتائیں؟ ______ (صادق طفیل' لاہور)

ج بال پوائنٹ "لازلو جوزف بیرو" نامی ایک شخص نے 1937ء میں ایجاد کیا۔ اس کا تعلق یورپی ملک ہنگری سے تھا۔

■ گوشت خور پودے کہاں پائے جاتے ہیں؟ ______ (اقراء یونس' راولپنڈی)

ج گوشت خور پودوں سے مراد ایسے پودے ہیں جو اپنے اوپر بیٹھنے والے کیڑوں مکوڑوں کا شکار کرتے ہیں مثلاً وینس فلائی ٹریپ، سن ڈیو اور بلیڈر ورٹ وغیرہ۔ یہ زیادہ تر براعظم شمالی امریکہ اور بحرالکاہل کے جزائر میں پائے جاتے ہیں۔

■ دنیا کے سب سے گہرے اور سب سے کم گہرے سمندر کے نام بتائیں؟ ______ (حسن اختر' کراچی)

ج سب سے گہرا سمندر، بحرالکاہل ہے، جبکہ بحیرہ بالٹک جس کے اطراف میں یورپ کے مشہور ممالک فن لینڈ، سویڈن، ناروے، لیٹویا، اسٹونیا اور لیتھونیا شامل ہیں، یہ دنیا کا سب سے کم گہرائی والا سمندر ہے۔

■ دنیا کی پہلی یونیورسٹی کہاں قائم ہوئی تھی؟ ______ (شاہد منصور علوی' کراچی)

ج مصر کے شہر اسکندریہ میں آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے سکندرِاعظم کے حکم سے ایک بہت بڑی درس گاہ قائم کی گئی تھی، جہاں اس زمانے کے تمام علوم سکھائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹیکسلا میں بھی ایک یونیورسٹی کی باقیات ملتی ہیں، اسے اس دور میں جولین یونیورسٹی کہا جاتا تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق یہ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل قائم کی گئی تھی۔ مورخین کے مطابق انہیں دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیاں کہا جاسکتا ہے۔

■ NASA کن الفاظ کا مخفف ہے؟ ______ (طیبہ منیر' اوکاڑہ)

ج ناسا امریکی خلائی تحقیقی ادارے کا نام ہے اور اس سے مراد ہے:

"National Aeronautics and Space Administration"

سکس ملین ڈالر مین

کیا آپ نے کبھی ایسا مافوق الفطرت انسان دیکھا ہے، جو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہو۔ اس کے ہاتھوں میں کسی کرین کے برابر طاقت ہو یا پھر اس کی آنکھ میلوں دور تک دیکھ

Lee Majors

سکتی ہو؟ جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک کچھ اہم بات کر رہے ہیں آج سے تقریباً تین دہائیوں قبل ٹیلی وژن کے ایک مقبول عام پروگرام "سکس ملین ڈالر مین" کی۔

یہ پروگرام ایک ایسے خلاباز کے بارے میں تھا، جس کے دونوں پیر، ایک ہاتھ اور ایک آنکھ حادثے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسٹیو آسٹن نامی یہ خلاباز اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اس ادارے میں بہت اہمیت کا حامل تھا، اس لیے سائنس دان یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اسٹیو کو دوبارہ اس قابل بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو مشینی ٹانگیں، ایک مشینی ہاتھ اور ایک برقی آنکھ تیار کی جاتی ہے۔ جن کو اسٹیو کے جسم کے ضائع شدہ اعضاء کی جگہ لگا دیا جاتا ہے اور ان کو کنٹرول کرنے کے لیے دماغ میں ایک مائیکرو چپ لگا دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ایک بار پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس کی مشینی ٹانگوں اور ہاتھ میں عام انسانوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ طاقت تھی اور اس کی برقی آنکھ میں کئی میل دور تک دیکھنے کی صلاحیت تھی۔ اس منصوبے کی تکمیل پر چھ ملین امریکی ڈالر کے اخراجات آئے۔ جب اسٹیو کو دوبارہ خلاباز کے طور پر آزمایا گیا تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ اب اس کام کے قابل نہیں رہا۔ اتنے اخراجات کے بعد یہ بات ناقابل برداشت تھی، اس لیے اسٹیو سے کوئی دوسرا کام لینے کا فیصلہ کیا گیا اور اسے امریکی پولیس کے خفیہ محکمے میں سیکریٹ ایجنٹ کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ یوں پہلا بائیونک سیکریٹ سروس ایجنٹ کا کردار تخلیق ہو گیا۔ یہ پروگرام دنیا بھر میں بے حد مقبول ہوا اور بچے جگہ جگہ اسٹیو آسٹن کی نقل کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اسٹیو آسٹن کا کردار ایک امریکی اداکار لی میجرز نے کیا تھا۔

اس دور میں اس پروگرام کو محض ایک سائنس فکشن فینٹیسی (Fantasy) سمجھا جاتا تھا، لیکن درحقیقت یہ بائیونک انڈسٹری کا آغاز تھا۔ طب کے شعبے والوں کے لیے بھی تحقیق کی نئی شروعات تھیں کہ کس طرح حادثاتی طور پر ضائع ہو جانے والے انسانی اعضاء کو مشینی پیوند کاری کے ذریعے قابل استعمال بنایا جا سکے گا۔

گزشتہ دنوں تجرباتی بائیولوجی 2006، کی میٹنگ میں دنیا بھر سے 12000 افراد نے شرکت کیں۔ اس میٹنگ میں ماہرین نے بتایا کہ وہ "سکس ملین ڈالر مین Hu" کی تکمیل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں، جو بالکل اسٹیو آسٹن کی طرح ہی ہوگا۔ ان

جاپان میں ماہرین نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح کسی انسان میں ٹانگ اور برقی ہاتھ، پاؤں اور آنکھ کام کر سکتی ہے۔

مشینی ٹانگیں: کمپیوٹر سے کنٹرول ہونے والی یہ ٹانگیں 200 پونڈ وزن آسانی اُٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان ٹانگوں کو انسانی جسم کے ساتھ برقی پٹیوں کی مدد سے منسلک کر دیا جائے گا۔ ٹانگوں سے منسلک مصنوعی ٹانگیں، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے کے سائنس دان ہمایوں کزرونی (Humayayoou Kazarooni) نے تیار کی ہیں۔ ڈاکٹر کزرونی کا کہنا ہے یہ ٹانگیں زیادہ تیزی سے حرکت کر سکتی ہیں، خاص طور پر عسکری مقاصد میں تو ان کو بہت ہی کارآمد

کہا جا رہا ہے، ان کی مدد سے سپاہی کہیں زیادہ وزن اٹھا کر بآسانی چل سکتے ہیں، گویا ان میں سپرمین کی طاقت آ جائے گی۔

مشینی ہاتھ: بائیونک ہاتھ کو "ڈیکسٹرا" Dextra کا نام دیا گیا ہے، اس مشینی ہاتھ کی انگلیاں دماغ میں نصب مائیکرو چپ کی مدد سے کام کرتی ہیں اور ان کو فائبر آپٹکس کی مدد سے دماغ کے اعصابی سسٹم سے منسلک کیا گیا ہے۔ اس کے سنسرز (Sensors) انگلی کے پچھلی طرف لگا دیے گئے ہیں۔ اس کو استعمال کرنے والا تھوڑی سی تربیت کے بعد اس مصنوعی ہاتھ کو قدرتی اعضا کی طرح سے استعمال کر سکے گا۔ ڈیکسٹرا کا استعمال کنندہ اپنی انگلیوں کو بالکل ایسے ہی استعمال کر سکے گا، جس طرح وہ اپنے قدرتی ہاتھ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

برقی آنکھ: بائیونک آنکھ کی تیاری کا کام نینو ٹیکنالوجی کا سب سے زیادہ پیچیدہ اور حساس کام ہے۔

بائیونک آنکھ کے استعمال کے لیے ایک جیبی سائز کا کمپیوٹر پروسیسر ڈیزائن کیا گیا ہے اور اس میں مختصر سی بیٹری لگائی گئی ہے۔ ریٹنا (Retina) کے ساتھ ایک چاول کے دانے کی جسامت سے بھی مختصر چپ لگائی گئی ہے اور ایک مختصر سا ویڈیو کیمرا خصوصی چشمے پر لگا دیا گیا ہے۔ اس آنکھ کی مدد سے ان افراد کو فائدہ پہنچے گا، جو کسی بیماری کی وجہ سے اپنی بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

برقی کان: یونیورسٹی آف سارلینڈ جرمنی کے ماہرین نے سب سے پہلے اس بات پر تحقیق کی کہ انسانی دماغ کس طرح سے کان کے پردے پر پڑنے والی آواز کو شناخت کرتا ہے اور کان کے پردے اور دماغ کے خلیوں کے درمیان کس طرح رابطہ قائم ہوتا ہے۔ اس تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں ماہرین نے نہایت مختصر قامت مائیکرو چپ تیار کی ہے، جو سماعت سے محروم افراد کے لیے بالکل ایسے کام کرے گی، جیسے عام انسان کا صوتی نظام کام کرتا ہے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے "Cochlea" نامی آلہ استعمال ہو رہا ہے، جو دیگر سماعتی آلات سے مختلف ہے اور جس کے استعمال سے بہت مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

مندرجہ بالا کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں سکس ملین ڈالر مین حقیقت کا روپ دھار لے گا۔

☆☆☆

آپ بھی لکھیے

طنز بری عادت ہے

بلال سعید، بہاولپور

کسی پر طنز کرنے کا کتنا اچھا موقع کیوں نہ ہو اور آپ کی زبان اور قوت ادا ہی ایسی ہو کہ اس کو طعنوں کا نشانہ بنایا جائے۔ لیکن پھر بھی آپ چند لمحے ٹھہر کر سوچیں کہ آپ کی چند لمحوں کی خوشی کسی دوسرے کے دل میں کتنا گہرا گھاؤ لگا دے گی۔ کیونکہ زبان اگرچہ گوشت کی ہے لیکن تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ بات اگرچہ تیر نہیں مگر تیر سے زیادہ وار کرتی ہے۔

کسی کی دل شکنی کے بعد دل جوئی کے ہزاروں طریقے ہیں۔ مگر کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے مگر اس زہر کا ازالہ کرنا محال ہے۔ کیونکہ صرف ہاتھوں سے لگنے کے زخم گہرے نہیں ہوتے بلکہ زبان سے لگنے زخم زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ کوشش کیجیے کہ اپنے نیک اعمال سے لوگوں کا دل جیتیں اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں سے نرمی محبت اور شفقت کا سلوک کریں۔

کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن ترازو میں جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی، وہ حسن اخلاق ہے۔

(پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

قوم کا محسن

محمد جنید، واہ کینٹ

اگر غور سے دیکھا جائے تو استاد کی حیثیت، اہمیت اور مقام مسلم ہے۔ استاد ہی نونہالان وطن کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ استاد ہی قوم کے نوجوانوں کو علوم و فنون سے آراستہ کرتا ہے۔ جب والدین بچے کی جسمانی پرورش کرتے ہیں۔ جبکہ استاد کے ذریعے ان کی روحانی تربیت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "جس شخص نے مجھے ایک لفظ سکھایا وہ میرا استاد ٹھہرا اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔" مشہور خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹے مامون اور امین اس بات پر جھگڑتے تھے کہ استاد کے جوتے کون اٹھا کر لائے۔ آخر استاد کے کہنے پر دو ایک ایک جوتا اٹھا لائے۔ حضرت امام غزالی کا قول ہے کہ جب تک تم اپنا سب کچھ علم کو نہ دو گے، وہ علم تمہیں کچھ نہ دے گا۔ جہاں طالب علم پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ استاد کا احترام کرے، وہاں استاد کو بھی چاہیے کہ اپنے شاگرد پر محنت سے توجہ دے۔ انہیں آئندہ کے لیے درخشندہ ستارہ بنانے کی کوشش کرے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ استاد کے سامنے تکبر، غرور و تکرار نہ کرے بلکہ عاجزی و انکساری اور ادب سے پیش آئے اور کبھی کلاس میں استاد سے نہ جھگڑے۔ علامہ اقبال کہا کرتے تھے "میرا باپ مجھے زمین پر لایا اور میرا استاد مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا۔" یہ سب احترام استاد۔ علامہ اقبال، مولوی میر حسن کے شاگرد تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ سیالکوٹ کے ایک بازار میں علامہ اقبال نے اپنے استاد کو چلتے دیکھا تو علامہ اقبال ننگے پاؤں اپنے استاد کو گھر تک چھوڑ آئے۔

طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ استادوں کا ادب کریں اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھا کریں۔

(دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

قلم

[illegible]

قلم خیالات و علم و فن کو منتقل کرنے کی ایک اہم قوت ہے جس میں پہاڑوں کی سربلندی، سمندروں کی دلکشی، دریاؤں کی روانی اور علم و ہنر کی روشنی ہے۔ جب دماغ لکھتا ہے تو قلم بولتا ہے اور جب قلم بولتا ہے تو دل لکھتا ہے۔

قلم اب میدان کے ہاتھ میں ہو تو خون کی ندیاں بہا دیتا

جب ملک کے ہاتھ میں ہو تو ہڈیاں توڑتا ہے۔ جب سیاست دان کے ہاتھ میں ہو تو وحشت و تکبر سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ عزت مند قلم اس کا ہے جس نے حق کی تحریر لکھی اور سب سے زیادہ خطرناک قلم اس کا ہے جس نے کسی بھی جھوٹی دستاویز پر دستخط کیے۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

بہترین دوست

سہیل صغیر، فیصل آباد

یہ بات بالکل درست ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہوتی ہے۔ کتاب سے محبت اور دوستی اچھی لوگوں کو ہوتی ہے جو علم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ کتاب اپنے اندر علم کا خزانہ چھپائے رکھتی ہے، جو کبھی نہ ختم ہونے والا ہے اور اسے وہی شخص تلاش کر سکتا ہے جو حصول علم کی سچی تڑپ رکھتا ہو۔ ان لوگوں کے لیے کتاب ایک مخلص دوست ہے، بلکہ ایک رہنما بھی ہے، جو اپنے پڑھنے والوں کو زندگی کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سے آگاہ کرتی ہے اور سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کرتی ہے۔ یہ انسان کے ذہن کو وسعت دیتی ہے اور اسے گہرائی میں جا کر سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

کتاب گھر بیٹھے دنیا کی سیر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ کتاب پڑھنے والا شخص کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی کوئی نئی کتاب پڑھتا ہے تو اسے ایک نئی دنیا نظر آتی ہے، جس میں وہ اپنے آپ کو چلتا پھرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کتاب ہر بار اسے نئے تجربات دکھاتی ہے۔ جو آدمی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اسی لیے کتاب سے بڑھ کر کوئی رفیق، ہمدرد اور ہمجولی نہیں۔ یہ ایک انمول دولت ہے اور بیش قیمت جوہر ہے۔ اسی لیے ہمیں چاہیے کہ اسے ہمیشہ اپنا دوست رکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ہمیں کتب سے حاصل ہونے والے علم پر عمل کریں اور دوسروں کو کتاب پڑھنے کی ترغیب دیں۔ (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

غربت

بازہ جدون، پشاور

جون کا مہینہ تھا۔ بہت زیادہ گرمی پڑ رہی تھی۔ احمد بیٹھا ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ احمد نے آواز سنی مگر ٹس سے مس نہ ہوا کہ دروازہ کھول لے۔ اُسے معلوم تھا کہ اس وقت دستک دینے والا کون ہے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ گھنٹی بجنے لگی۔ احمد کی امی نے کچن سے احمد کو دروازہ کھولنے کا کہا اور احمد کو ناچار اٹھنا پڑا۔ احمد نے دروازہ کھولا۔ سامنے گندگی سے اٹے کباڑی بچے کھڑے روٹی مانگ رہے تھے۔ احمد کا تو پہلے سے ہی پارہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ سنتے ہی اور زیادہ غصہ میں آیا۔ "ابھی تو دے دیتا ہوں مگر اس کے بعد کبھی مت آنا۔" احمد نے بچوں کو ڈپٹ کر کہا۔ احمد کو گندگی اور گندے بچوں سے سخت چڑ تھی۔ اس کو غریبوں سے محض اس وجہ سے انتہا درجہ کی کوفت محسوس ہوتی تھی۔ امی کچن کے کام سے فارغ ہوتے ہی احمد کے پاس آئیں اور اس کو سمجھانے لگیں۔ "بیٹا! یہ غریب لوگ بھی معاشرے کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی بھی وہی عزت ہوتی ہے جو ہماری ہوتی ہے۔ اگر یہ غریب لوگ نہ ہوتے تو ان سے متعلق بہت سے کام ہم کو خود ہی کرنے پڑتے۔ زمین پر اگنے والے پھل، پھول اور سبزیاں سب انہی غریبوں کی محنت ہی تو ہے اور بیٹے اگر غربت کوئی گناہ یا بری شے ہوتی تو حضور پاک ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے امیر بننے کی دعا کرتے جنہوں نے اپنی پوری زندگی غربت اور کسمپرسی میں گزاری۔" امی یہ کہہ کر کسی کام سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں مگر احمد کو روشنی کی ایک نئی راہ دکھا گئیں۔

(پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

انعامی بانڈ

تحریم افضل، راولپنڈی

جب کسی کا انعامی بانڈ نکلنے والا ہوتا ہے تو وہ بہت بے چین ہوتا ہے مگر کیا کسی نے کبھی سوچا ہے کہ اصلی انعامی بانڈ تو زندگی کے بعد اللہ کی عدالت میں نکلنے والا ہے اور جس میں کامیابی حاصل کرنا بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔ اس انعامی بانڈ میں کامیابی کا اہم ذریعہ نیکیاں ہیں جن کو حاصل کر لینے سے اس انعامی بانڈ میں کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کے انعامی بانڈ کی فکر نہ کرے بلکہ آخرت کے انعامی بانڈ کی فکر کرے تاکہ وہ اپنی اصلی منزل کو پا لے۔

☆☆☆

دَم ہے تو!

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

(اقبال)

9 نومبر کی ایک روشن اور سہانی صبح تھی۔ اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ایک غیر ملکی ائرلائن "پاک فلائیٹ" کا طیارہ بوئنگ 737B اپنی افتتاحی پرواز کے لئے تیار تھا۔ طیارے کا عملہ دو افراد پر مشتمل تھا۔ طیارے کا کپتان پاکستانی محمد شاہین اور ایک غیر ملکی کو پائلٹ جان جیری کاک پٹ میں اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ 10 بج کر ایک منٹ کے بعد کنٹرول ٹاور سے اجازت لے کر جہاز نے آہستہ آہستہ رن وے پر رینگنا شروع کیا۔ اس وقت جہاز میں عملے کے 9 افراد کے علاوہ 141 مسافر سوار تھے جن میں بیشتر غیر ملکی تھے۔ جہاز کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور مسافروں کو حفاظتی بند باندھنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ جہاز ٹیکسی کرتا ہوا رن وے کے سرے پر پہنچا اور پھر پوری طاقت سے ہوا کو چیرتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ اس وقت اسلام آباد میں موسم خاصا ابر آلود تھا۔ جہاز مقررہ بلندی پر پہنچ کر اپنی سمت پر محو پرواز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کی بتیاں روشن ہو گئیں اور حفاظتی بند کا اشارہ بھی بجھا دیا

کچھ تھوڑے ... لگے ہیں کیپٹن محمد شاہین کی آواز سنائی دی۔ وہ انگریزی اور اردو میں اعلان کر رہے تھے "خواتین و حضرات! ہم معمول کے مطابق ... ہماری پرواز ... 9 ... ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم ٹھیک ... بعد عظیم ہمالیہ کی سطح ارض کے اوپر سے پرواز کریں گے اور آپ لوگ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی K2 کا نظارہ کر سکیں گے۔ شکریہ"

جہاز میں کیپٹن محمد شاہین کے بیٹے انشاء اور بیٹی بھی سوار تھے۔ انشاء اسلام آباد کے ایک ڈگری کالج میں اردو ادب کا طالب علم تھا جبکہ ... میڈیکل کالج میں ... سال کی طالبہ تھی۔ انشاء نے اپنے پاس میں بیٹھے پٹھان بزرگ کو بتایا کہ وہ اپنے ابو کیپٹن محمد شاہین کے ساتھ چھٹی کی سیر کرنے جا رہے ہیں اور وہاں پر یوم اقبال کے تقریری مقابلے "اقبال ہمارا ہے" میں حصہ لیں گے۔ اچھا اقبال تو ہمارا بھی پسندیدہ شاعر ہے، یارو تم تقریر سناؤ ... کے اصرار پر انشاء مسافروں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے لگا۔ مسافر بھی اس کی تقریر غور سے سننے لگے۔ کیونکہ اس وقت ٹی وی پر بھی فلم دکھائی جا رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا

"محترم حاضرین! السلام علیکم! آج 9 نومبر کا دن ہمیں حضرت علامہ اقبال شاعر مشرق کی ولادت یاد دلاتا ہے کہ کس طرح سیالکوٹ کے محلہ چوڑی گراں میں جنم لینے والا بچہ اپنی مثال آپ اور رہبر و رہنما بنا۔ میں آپ کو روایتی مقررین کی طرح اقبال کا معروف شعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ساری تقریر پیش دی کا علامہ اقبال کے پیغام پر کہ
...ساری ... مقصد تو امتِ مسلمہ کی بیداری تھی
...اقبال کا ... کر گئے ہیں کہ

... ہے ... بستہ ... کر دیا ... کر ...
... ہے ... تنہا ... کر ...
... میں ہم ...

معزز حاضرین! اقبال ہمیں جگانے آئے تھے۔ وہ عمر بھر سمجھاتے رہے کہ

... اگر زندوں میں ہے
اپنی دنیا آپ پیدا کر

ادھر وقاص کی تقریر جاری تھی ادھر کاک پٹ میں عمران جہان ... اس نے اپنی نشست پر سر رکھ کر آنکھیں بند کی ہوئی تھیں ... کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے عمران؟ تم بہت بے چین لگ رہے ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔ مگر ذرا پریشان ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ کیا مسئلہ ہے؟"

"بس اتنا سا مسئلہ ہے، میری رقم کہیں پھنسی ہوئی ہے۔ بہرحال مدد کی کوشش کا شکریہ۔"

اب شاہین خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس بولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جہاز اب ... پہاڑی سلسلے پر سے گزر رہا تھا اور ہوا تیز تھی۔ شاہین کی تمام تر توجہ جہاز پر تھی۔

ادھر وقاص جہاز کے کیبن میں اپنی تقریر کا اختتام کر رہا تھا۔

"معزز حاضرین! میرا مقصد محض تقریر کرنا نہیں بلکہ آپ کو پیغام اقبال یاد دلانا ہے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، اپنی زندگی کا مقصد پورا کیجئے۔ علامہ اقبال ہم سے بہت پرامید ہیں، ان کی امید پر پورا اتریئے۔ وہ تو خود کہہ رہے ہیں کہ

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"

وقاص حاضرین کی داد وصول کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

خان بابا جی بولے "ہمارا جوان تو کمال کرتی ہے۔"

منیفہ ہنس کر بولی "خان بابا! یہ اچھی باتوں کے علاوہ بری باتیں بھی کر سکتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، اس نے میرا سیب کھا لیا اور اس کے چھلکے ہمارے ... کے پاس پھینک آیا۔ اب آپ ہی بتائیں کیا کسی کا چھپا ہوا سیب کھانا منع ہے؟"

وقاص نے جواب میں بہن کی بھی تاریخ بیان کی اور ان دونوں کے درمیان کھلی جنگ کا آغاز ہوا تو خان بابا ہنس ہنس کر مرچ مسالا لگانے لگے — "بہت خوب، لڑکا ٹھیک کہتی ہے — اور لڑکی

سے وہ بیٹھے گئے۔
تک کہتے ہے "اس پاس بیٹھے ... ہو گئی اور جہاز کی پرواز بھی جہاز کی سمت تبدیل ہو چکی ... گئی تھی کہ آنکھیں موندے بیٹھے ہو گئی۔ شاہین نے ... شاہین نے جہاز کے کنٹرول کو چیک کیا ... مسافروں کو کھانے ... اس نے سوچ کا جائزہ لیا اور پھر پیچھے کی ... کے ساتھ چلنے لگے۔ اب اپنے بچوں کے پاس ... تو نیری جہاز کا کنٹرول سنبھالے دوبارہ کاک پٹ میں وہاں بیٹھا ... وہ ابھی تک میں موسیقی بھی سن رہا تھا۔

"نیری! تم بے فکر آرام کرو، میں کنٹرول سنبھالتا ہوں۔"

شاہین نے چہتے ہوئے کہا۔

"میری طبیعت ابھی بھی خراب نہیں، اگر خراب ہوتی تو میں پاکستان میں ہی رک جاتا یا اقبال ہوائی اڈے کی درخواست کرتا۔" شاہین نے اپنی نشست سنبھال لی اور اعلان کیا کہ طیارہ اب چین کی حدود میں داخل ہو چکا ہے اور ہم اس وقت پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔

نیری نے اب موسیقی بند کر دی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اچانک شاہین کی نگاہ خودکار ریڈیو کمپس پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ طیارے کا رخ بیجنگ کی بجائے کسی اور سمت جا رہا تھا۔

"ارے! تم غلطی کر رہے ہو، اپنی ڈائریکشن چیک کرو" وہ نیری سے بولا۔

"نیری ابھی غلطی نہیں کرتا۔ میں اس وقت صرف پائلٹ نہیں بلکہ ہائی جیکر بھی ہوں۔" اسے جواب ملا۔

"ہوش کے ناخن لو... میں تیری حماقت چھپانے پر تیار ہوں۔ جہاز کا رخ موڑو ورنہ تم جانتے ہو کہ یہ خصوصی پرواز حکومت پاکستان کی فرمائش پر شروع کی گئی ہے تاکہ یورپی افراد باسہولت چین جا سکیں۔ اس طیارے کا اغوا پاکستان کی عزت پر دھبا ہوگا اور تم جانتے ہو کہ پاکستان اپنے اوپر دھبا برداشت نہیں کرے گا۔ نتائج کا سوچ لو۔"

وہ بولا "آج مجھے بہت بڑی رقم ملے گی۔ وحشت گرد مجھے مالا مال کر دیں گے، بلینک چیک اور رہنے کے واسطے ایک جزیرہ۔"

شاہین نے نیری پر حملہ کرنے کے لیے پینترا بدلا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ گو شاہین جسمانی طور پر نیری سے کہیں زیادہ طاقتور اور پھرتیلا تھا لیکن نیری نے گن پوائنٹ پر شاہین کو باہر نکال کر کاک پٹ بند کر لیا تاکہ وہ اطمینان سے طیارہ کہیں اور لے جائے۔

شاہین نہیں چاہتا تھا کہ مسافروں کو اس مسئلے کا علم ہو مگر نیری نے خود ہی اعلان کر کے انہیں مطلع کیا کہ طیارہ اغوا ہو چکا ہے۔ سب مسافروں میں یکدم ایک ہلچل مچ گئی، عورتیں رونے بیٹھ گئیں۔ بچے کچھ سہمے ہوئے تھے کہ شاید طیارہ تباہ ہونے جا رہا ہے پس وہ بھی عورتوں کا ساتھ دینے لگے۔ جہاز کا عملہ شاہین کے ساتھ مل کر مسافروں کو دلاسہ دے رہا تھا۔

ایک آسٹریلوی بولا "اس ہوا باز نے اسلحہ کہاں سے حاصل کیا؟ کیا پاکستان سے؟"

ایک انگریز لڑکی بولی "ہمیں دلاسا دیں جو بھی ہوگا اب برا ہی ہوگا۔" اور خان بابا گرجے "یہ کافر کا بچہ ہمارے قابو آگیا تو اپنے کتوں کے سامنے ڈال دوں گا جو روزانہ ایک بھیڑ کا گوشت کھاتے ہیں۔"

انشا اپنے ابو کے پاس آگیا "ابو! آپ کاک پٹ کا دروازہ کیوں نہیں کھلواتے... اسے توڑ ڈالیں۔"

"بیٹا! یہ دروازہ اندر سے ہی کھلے گا... یہ بہت مضبوط ہے اسے توڑنا آسان نہیں۔"

انشا کچھ سوچ کر بولا "اقبال ہی تو کہتے ہیں کہ

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

تو پھر آپ ڈیڑھ سو افراد کی زندگی ایک مجرم کے ہاتھوں میں نہ دیں... کیا آپ خود شاہین ہو کر بھی پرواز سے تھک رہے ہیں؟ کسی طرح بھی اس شیطان کو قابو کریں۔"

تب شاہین چونک اٹھا۔ اس نے کچھ سوچ کر ایک ٹیکنیشن کو بلایا اور کاک پٹ کے باہر موجود ایک بکس کھلوا کر ایک پائپ بند کروا دیا۔ یہ پائپ ہوا بند کاک پٹ میں آکسیجن مہیا کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد نیری انٹرکام پر چیخ اٹھا۔

"شاہین تم زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ اور پائپ کھول دو ورنہ

جہاز کریش کر دوں گا۔"

شاہین نے کمال ہوشیاری سے جواب دیا "مسٹر یوری آپ کو [illegible] بھی ہوئی ہے اس وقت جہاز میں آکسیجن کا لیول خطرناک حد تک کم ہو چکا ہے مسافر بے ہوش ہو رہے ہیں اب ایمرجنسی لینڈنگ بہت ضروری ہے۔"

یوری نے جواب میں اسے گالیاں دے کر کہا کہ وہ جہاز کریش کر دے گا۔

"یوری جیسے انسان کو بزدل ملتی ہے تم ایسا نہیں کر پاؤ گے [illegible] اور لمبا چوڑا جزیرہ کہاں جائے گا۔" شاہین نے کہا۔

یوری بولا "شاہین ڈیئر! میں تمہیں بھی حصہ دلوا دوں گا۔ پلیز! ابھی سسٹم ٹھیک کرو۔"

"میں شاہین ہوں غرور نہیں کھاتا، کاک پٹ کھولو، میں لینڈنگ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

یوری جواب میں اول فول بکنے لگا تو شاہین نے فون بند کر دیا [illegible] میں موجود ہیکرز بھی آف کر دیئے وہ جانتا تھا کہ یوری جیا لگھس ہے یہ مسافروں کو بلیک میل کر کے آکسیجن کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ چند لمحوں بعد کاک پٹ کا دروازہ کھلا تو اس میں سے یوری برآمد ہوا۔ اس نے ماؤزر سنبھال رکھا تھا۔ اسے شاہین کہیں نظر نہ آیا اور آتا بھی کیسے ... وہ تو گھات لگائے کھڑا تھا اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے اس کا ماؤزر ہوا میں اچھال دیا جو خان بابا نے قابو کر لیا۔ پھر دونوں ہوا باز الجھ پڑے۔ صرف چار پانچ سیکنڈز میں شاہین نے دشمن کو قابو کر لیا۔

خان بابا نے ماؤزر تان کر کہا "ہم بہت بڑا نشانہ باز ہے ذرا چالاکی کیا تو مار گراتا ہے ہم اب اس چوہے کے بچے پر نشانہ لگائے گا۔"

شاہین نے خان بابا کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے روکا اور کاک پٹ میں جا کر جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا۔ یوری نے اعتراف کر لیا کہ وہ دہشت گردوں کا ساتھی ہے اور دہشت گرد نہیں چاہتے کہ پاک چین دوستی قائم رہے کیونکہ چین گوادر میں دنیا کا بہت بڑا سی پورٹ بنا رہا ہے۔ گوادر میں بندرگاہ مکمل ہوتے ہی دنیا کے دوسرے تجارتی اڈوں کا رخ ادھر ہو جائے گا اور پاکستان کے دشمنوں کو یہ گوارا نہیں۔ لہٰذا طیارہ اغوا کر کے پاکستان کو بدنام کرنا تھا۔

بیجنگ کی زمین سے اگلی کے ٹائرز چھوتے ہی تھے کہ دور دور تک ایئرپورٹ سیکورٹی نے محاصرہ کر لیا اور یوری کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہوا باز شاہین نے سارا اعزاز اپنے شاہین بچے انشا کو دیا۔ شاہین نے پیار سے انشا کے سر میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی تو اس کی انگلیاں اس کے بڑے بڑے بالوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

وہ ڈانٹ کر بولا "گدھے! یہ بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں؟"

وہ معصومیت سے بولا "حضرت علامہ صاحب ہی کہتے ہیں کہ

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

☆☆☆

سوال

"چور... چور... چور"

اس بڑے سے ڈیپارٹمنٹل سٹور پر عید کی خریداری کرتے ہوئے اچانک میرے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی۔ نیچے ایک عجیب شور سا برپا تھا۔ "چوری اور یہاں؟" سیلزمین لڑکے سے رسید بنواتے ہوئے میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں جی... ہو جاتا ہے کبھی کبھار اس طرح بھی، اتنا بڑا سٹور ہے۔ کچھ گاہک سامان لے کر ادائیگی کیے بغیر نکلنے کی کوشش میں پکڑے جاتے ہیں۔ آخر ہمارا بھی سیکیورٹی سسٹم ہے جی۔" سیلزمین ہنس کر بولا۔ رسید لے کر میں سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور نیچے اترتے ہوئے سامنے کا منظر نظر آتے ہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایک سیلزمین جمیو کا بازو پکڑے ہوئے تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔ اس میں اسی سامان تھا جو کل میں نے اسے دلوایا تھا یا وہ واقعی چوری کرتے پکڑی گئی ہے؟ میں نے پریشانی سے سوچا۔ روتی ہوئی جمیو چلا رہی تھی۔ "یہ سامان میرا ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔ یہ تو میں نے کل لیا تھا۔ یہ مجھے میری باجی نے لے کر دیا تھا۔" الفاظ ہچکیوں کے ساتھ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ لیکن وہاں اس کی سن کون رہا تھا۔ دکان عید کی شاپنگ کے لیے آنے والوں سے بھری ہوئی تھی۔ دوکاندار، سیلزمین اور گاہک ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ "شکل تو دیکھیں کتنی معصوم لگتی ہے۔"

"کام دیکھیں اور عمر دیکھیں۔"

"شکل مومناں، کرتوت کافراں۔"

"او جی شکل پر نہ جائیں، پولیس کو بلائیں پولیس کو۔ یہ کوئی گینگ ہے جو بچوں سے باقاعدہ چوریاں کرواتا ہے اور عید بقرعید پر تو ان کی اور چاندی ہو جاتی ہے۔" ایک گاہک افلاطون بنا دوکان کے مالک کو مشورہ دے رہا تھا۔

"توبہ توبہ... قیامت کی نشانی ہے یہ تو۔" دو عورتیں استغفار پڑھتی جا رہی تھیں۔

"مگر میں چور نہیں ہوں۔ یہ سامان میرا ہے۔" جمیو ہسٹریکل ہو کر چلائی۔ "اچھا یہ سامان تیرا ہے تو لا دکھا اس کی رسیدیں؟" سیلزمین اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"رسیدیں... ؟ رسیدیں تو باجی کے پاس ہیں۔" جمیو کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے نکلی۔ "کون باجی تیری تو... ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔ باجی کی بچی! اوئے... ذرا سامان تو چیک کرو

[illegible] اس چوری کی بچی نے۔" دوکاندار بولا اور ایک سیلزمین نے
[illegible] پر الٹا دیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا، اس میں وہی
[illegible] اور چیزیں تھیں جو کل اسے میں نے خرید کر دی تھیں۔
[illegible] وہ یہ دوکان پر لانے سے اس کا مقصد کیا تھا؟ میں
[illegible] ڈھال سی بھیمو اب فرش پر گھٹنوں پر سر
[illegible] تھی۔ "یہ سامان میرا ہے۔۔۔ میں چور نہیں۔" اس کی آواز
[illegible] رہی تھی۔ "دیکھیں جی۔۔۔ میں نہ دیکھ لیتا تو ہمیں
[illegible] چونا لگا گئی تھی۔" جس سیلزمین نے اسے پکڑا
[illegible] تھا۔ کہتی ہے یہ سامان اس کا ہے۔ شکل دیکھی
[illegible] سامان والی۔"

"اچھا۔۔۔ تو چور نہیں ہے تو چل اپنے گھر کا پتا بتا یا پھر
[illegible] کو فون کر کے بلا۔" فون کا چونگا پکڑے دوکاندار کو جیسے اس
[illegible] آیا۔

"نہیں۔۔۔۔ نہیں میں باجی کو نہیں بلا سکتی۔ وہ تو بہت
[illegible] کیا سوچیں گی۔" وہ گویا تڑپ کر بولی۔

"چھوڑیں جی۔۔۔ اس کی اسٹوریوں کو۔ آپ سیدھا سیدھا
[illegible] کو فون کریں۔" سیلزمین اکتا کر بولا۔

"ٹھہریں۔۔۔ یہ لڑکی چور نہیں۔ سامان کی رسیدیں میرے
[illegible]" اس سے پہلے کہ دوکاندار پولیس کا نمبر ملاتا۔ سیڑھیاں
[illegible] میں نے بلند آواز میں کہا۔

[illegible] گھر میں ملازمہ رکھنے کی ایک خاص وجہ تھی۔
[illegible] یہ تھا کہ گھر میں میرے اور دادو کے علاوہ کوئی نہ
[illegible] فوت ہو چکے تھے۔ ایک بڑا بھائی تھا۔ کے بعد
[illegible] کی موت نے اس پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ چپ
[illegible] دبئی چلا گیا۔ میری تعلیم پوری ہوئی تو میں نے
[illegible] کے سکول میں نوکری کر لی۔ بھائی کے دبئی چلے جانے سے
[illegible] نہیں رہا تھا۔ دادو میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر
[illegible] یوں تنہا کیسے چھوڑ دیتی۔ اور پھر ٹیچر بننا میرا بچپن کا خواب
[illegible] دیتی شور مچاتی رہتی۔ تب میں نے تو سوچا تھا
[illegible] ان کے بیاہ کروں گی۔ بھرے پرے دیکھوں
[illegible] ہے؟ لڑکا ہے تو وہ باہر جا بسا ہے اور

یہ لڑکی مجھے کسی گنتی میں ہی نہیں رکھتی۔ اے اللہ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے؟ میں تو مرنے کی دعا بھی نہیں مانگ سکتی۔"

دادو کا دل یا دن بدن بڑھتا دیکھ کر میں نے بھیمو کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ ہمارا محلہ سفید پوش لوگوں کا محلہ تھا اور ہمارے جیسے سفید پوش اور کچھ اچھے کھاتے پیتے گھروں سے آگے بند کی طرف ان خانہ بدوشوں کی آبادی تھی جو پہلے یہاں جھگیوں میں آکر آباد ہوئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ان جھگیوں نے چھوٹے چھوٹے کچے گھروں کی شکل لے لی تھی۔ اگرچہ یہ لوگ اب قریہ قریہ گھومنا چھوڑ چکے تھے لیکن ان کی عادات ابھی بھی نہیں بدلی تھیں۔ وہی گھروں میں پڑے جاہل نشہ باز مرد اور ارد گرد کی آبادیوں میں چوڑیاں بیچتی یا محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی عورتیں۔ ان لوگوں نے اپنے بچے بھی بڑی بڑی کوٹھیوں میں ملازم کروا رکھے تھے۔

بھیمو سات آٹھ سال کی ایک دبلی پتلی سانولی سی بچی تھی۔ جب اس کی ماں اسے ہمارے ہمارے یہاں چھوڑنے آئی تو غربت اور فاقہ کشی ان کے انگ انگ سے ظاہر تھی۔ "بی بی مجھے اس کی تنخواہ کا اتنا لالچ نہیں۔ بس یہ ہے کہ کل کو جب یہ بڑی ہو گی تو اس کے بیاہ پر دان دہیز دینا آپ کی ذمہ داری ہو گا۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر دادو سے کہا تھا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ ہم اسے اپنی بچی کی طرح رخصت کریں گے۔" بعد میں مجھے پتا چلا۔ ان لوگوں کی بچیاں شہر میں بڑی بڑی کوٹھیوں میں اسی شرط پر نوکر تھیں۔

بہرحال، بھیمو دادو کے لئے ایک بہترین مشغلہ ثابت ہوئی۔ دادو اس عمر میں بھی گھر کا زیادہ تر کام کاج خود کرنا پسند کرتی تھیں۔ اب سارا دن بھیمو کو بھی ساتھ لگائے رکھتیں۔ کام سے فارغ ہوتیں یا ان کی اپنی عبادت کا ٹائم ہوتا تو اسے بھی وضو کرا کر نماز سکھاتیں۔ سیپارہ پڑھانے لگتیں۔ اس کا شوق اور دلچسپی دیکھ کر میں نے اسے اردو کی ابتدائی کتابیں بھی دلا دی تھیں۔

"بھیمو تجھے سکول پڑھنے کا شوق نہیں؟" میں نے پوچھا تھا۔ "شوق تو بڑا ہے جی۔ پر ابا بیمار رہتا ہے اور بہن بھائی چھوٹے ہیں۔ گھر کا خرچہ مجھے اور اماں کو ہی چلانا پڑتا ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔ "چل تو دادو سے پڑھا کر۔" میں نے کتابیں اسے تھماتے ہوئے کہا تھا اور اس کی آنکھوں میں جیسے خوشیوں کے ستارے سے

تھا رکھے تھے۔

اور میں بہت خوش ہوتی تھی کہ میں ایک بہت بڑی نیکی کر رہی ہوں، علم کی روشنی سے نواز رہی تھی۔ خود رہی تھی ایک ضرورت مند کو۔ یہ سوچ مجھے نیکی کے ایسے بلند درجے پر لے جا بیٹھاتی جہاں بیٹھ کر مجھے وہ سب لوگ بہت چھوٹے چھوٹے نظر آنے لگتے جو چائلڈ لیبر پہ لگاتے تھے اور ان کے حقوق دلوں میں رحم کا جذبہ کبھی سر اٹھاتا ہی نہیں۔ لوگ کہتے ہیں سکول میں میری تعریف کرتے تھے کہ ہالی نے اپنی نوکرانی کو بھی گھر کے فرد کی طرح رکھا ہوا ہے۔ محلے کے دیگر گھروں میں کام کرنے والیاں اس پر رشک کرتیں۔ میں اس چیز کی بھی عادت کی مالک کر دیتی۔ لیکن مجھے افسوس اس بات پر تھا کہ میں اس کے اندر کی بھوک کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ دادو اسے وافر کھانا دیتی تھیں۔ جس میں سے تھوڑا بہت کھا کر وہ باقی کھانا چھوڑتی۔ "میں گھر جا کر کھاؤں گی جی۔" وہ کہتی۔

"گھر لے جانے کے لئے اور لے لینا۔" دادو کہتیں۔ "آپ دے دیا کی...... میں کھاؤں گی۔" شام ڈھلے گھر جاتے ہوئے دادو اسے باقی بچا کھچا کھانا بھی سمیٹ کر دے دیتیں لیکن اس کی نظر کھانے کی پلیٹ سے نہ ہٹتی۔

میں اپنے کئی جوڑے چھوٹے کروا کر اسے دے دیتی۔ کئی بار نیا جوڑا بھی بنوا دیتی۔ مگر ہر کپڑا ایک دو بار ہی تہمینہ کے تن پر نظر آتا پھر غائب ہو جاتا۔ "ارے تہمینہ وہ نیا جوڑا کہاں گیا جو میں نے تجھے پچھلے ہفتے دیا تھا۔" میں اسے پرانا سا پھٹا ہوا جوڑا پہنے دیکھ کر حیرت سے پوچھتی۔ "وہ جی میں نے کہا کام کاج میں خراب ہی ہو گا۔ اس لئے سنبھال دیا تھا۔" وہ سر جھکا کر کہتی۔ "پاگل خراب ہو جائے گا تو اور لے دوں گی تجھے۔" میں جھلاتی۔

"اچھا جی۔ کل وہی پہن آؤں گی۔" مگر وہ کل کبھی نہ آتی۔ یہاں تک کہ اس کے حلیے سے گھبرا کر میں اسے کوئی اور جوڑا دے دیتی۔ "دادو مجھے لگتا ہے اس کا لالچ اور بھوکا پن کبھی ختم نہیں ہو گا۔" میں دادو سے کہتی۔

"بیٹی یہ فقیر لوگ فاقہ مست ہوتے ہیں، ان کو ایسے ہی رہنے کی عادت ہوتی ہے تو خوا مخواہ چڑ جاتی ہے۔" دادو مجھے سمجھاتیں۔ میں جو استاد تھی بچوں کی نفسیات سمجھنے کی دعویدار تھی۔ ان کو تہذیب سکھانے پر مصور تھی۔ ہر طرح کی عنایات کی بارش کر دینے پر بھی نہ اس بچی کو سمجھ سکی تھی۔ نہ اس کی جو تھی چھڑا پائی تھی۔

آج کل روزے چل رہے تھے۔ اس روز میں شاپنگ کے لئے نزدیکی مارکیٹ جا رہی تھی۔ چلی تہمینہ تو بھی میرے ساتھ آج راشن بھی خریدنا تھا۔ مجھے پتا تھا وہیں پر سامان زیادہ ہو گا وہ خوش ہو گئی۔ اسے بھی بازار میں گھومتے پھرتے بہت مزہ آتا تھا۔

ایک لیباس سٹور کے پاس سے گزرتے ہوئے شوکیس میں لگا ہوا ایک خوبصورت لباس مجھے اتنا اچھا لگا کہ اسے خریدنے کے لئے اندر جا پہنچی۔ قیمت بھی مناسب تھی۔ اسے پیک کراتے ہوئے میں نے دیکھا تہمینہ بھی دوکان میں لگے بچوں کے ڈریسز کو بہت شوق سے دیکھ رہی تھی۔ گلابی رنگ کا تتلی کے پھولوں جیسے کپڑے کا بنا ہوا ایک خوبصورت فراک تو خاص طور پر اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ "یہ فراک اگر تہمینہ پہنے تو کتنی اچھی لگے اور...... اور میری نیکی اور غربا پروری کی کتنی دھوم مچے۔" ایک خیال میرے دل میں ابھرا۔ فراک کافی مہنگا تھا لیکن اپنی واہ واہ کروانے کے شوق میں، میں نے نہ صرف فراک بلکہ میچنگ جوتے کلپس اور جیولری بھی خرید ڈالی۔ فراک خرید کر میں بہت خوش تھی۔ اس لئے نہیں کہ میں نے کوئی بڑی نیکی کی تھی بلکہ اس لئے کہ محلے میں میری بہت تعریف ہونے والی تھی۔ ہاں آج کے دور میں ان دو ٹکے کے نوکروں پر کون اتنا مہربان ہوتا ہے۔ میں غرور سے سوچ رہی تھی۔ اپنی چیزوں والا شاپر پکڑ کر تہمینہ کا چہرہ بھی خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس روز ستائیسواں روزہ تھا ساری رات عبادت میں تہمینہ بھی میرے اور دادو کے ساتھ جاگی تھی۔ صبح دادو نے اسے سونے کے لیے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ "میں یہ سامان بھی...... ساتھ لے جاؤں جی۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں...... لے جا۔" نیند سے میرا برا حال تھا۔

ظہر کی نماز کے وقت میری آنکھ کھلی۔ نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر مجھے خیال آیا کہ کل میری کچھ شاپنگ ادھوری رہ گئی تھی۔ ویسے بھی روزے کو بہلانے کے لئے بازار

...سے چیک کرنا بہتر تھا جس ڈیپارٹمنٹل سٹور سے میں نے
...دو دن پہلے میں نے عید کا لباس خریدا تھا۔ آج وہیں سے مجھے
...کچھ چیزیں لینا تھیں۔ سو میں سیدھی اس سٹور پر پہنچی تھی۔
"یہ لڑکی چور نہیں ہے۔ اس کے سامان کی رسیدیں میرے
...پاس ہیں۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔
"میں بھی کہوں۔ یہ بچی دیکھی دیکھی کیوں لگ رہی ہے۔
...یہ آپ کے ساتھ ہی تو آئی تھی۔" ایک سیلز مین آگے آ کر
...کاؤنٹر پر جا کر میں نے ایک روز پہلے خریدے ہوئے سامان کی
...رسیدیں اپنے پرس سے نکال کر چیک کرائیں۔ تب سامان کا بل ادا
...دکاندار بار بار مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔ "باجی آپ کی
...کل خریدا ہوا سامان بغیر رسیدوں کے آج دوکان پر لانے
...ضرورت کیا تھی۔ ہم تو یہی سمجھے اس نے ابھی اٹھایا ہے۔"

"میری غلطی یہ ہے کہ میں یہ سامان باجی کو بتائے بغیر آپ کو واپس کرنا چاہتی تھی۔" جمیمہ جو مجرم سی ایک طرف کھڑی تھی، اچانک سسک کر بولی۔ مجھے اس خوبصورت فراک سے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔" جمیمہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہ تھی۔ تو نے میرے تحفے کی یہ عزت کی؟ سچ ہے سستے کو کبھی نہیں پچتی۔ مجھے لگتا ہے تو پہلے بھی میرے دیئے کپڑے بیچتی ہی رہی ہے، جو آج یہ جوڑا لے کر بیچنے آ پہنچی ہے، ابھی چار دن پہلے ہی تو تجھے دو ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دی ہے۔" میں نے بے حد تلخی سے کہا۔

"باجی! پہلے آپ کے دیئے ہوئے کپڑے میری بہنوں کے تن ڈھکتے رہے ہیں۔ اور پھر تن تو پرانے کپڑوں سے بھی ڈھکا جا سکتا ہے۔ لیکن بیمار ماں باپ کو دینے کے لئے دوا نہ ہو اور چھوٹے بہن بھائی بھوک سے بلک رہے ہوں تو آپ ہی بتایئے عید کے روز جمیمہ اس نئے پریوں جیسے لباس میں کیسی لگے گی؟" جمیمہ نے میرے قدموں میں بیٹھ کر بلک کر پوچھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سٹور میں رکھی قیمتی چیزیں میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ ہنس رہی ہیں مجھ پر۔ جمیمہ کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆☆

اقوال حضرت عثمان غنیؓ

- اے انسان! خدا نے تجھے اپنے لیے پیدا کیا، تو دوسروں کا نہ بن۔
- خدا سے سوداگری کرو، خوب نفع کماؤ گے۔
- تلوار کا وار جسم کو زخمی کرتا ہے اور تلخ بات روح کو گھائل کرتی ہے۔
- سب سے بڑا خطاکار وہ ہے جو لوگوں کی برائیاں بیان کرتا ہے۔
- وہ علم جس کی آڑ میں دنیا کمائی جائے، بہت برا ہے۔

خاص بچے

یہ معذور بچے نہیں، خاص ہیں
سراپا محبت ہیں، اخلاص ہیں

یہ شہزادے ہیں قائد کے افکار کے
یہ پیکر ہیں، عزم اور کردار کے

یہ تابندہ سورج ہیں اس دور میں
نہیں ان کا پرتو کسی اور میں

عزیمت کی شمعیں جلاتے ہیں یہ
اندھیروں سے سب کو بچاتے ہیں یہ

یہ بچے ہیں، اچھے ہیں اور نیک ہیں
ارادوں کے پکے ہیں، سب ایک ہیں

کریں دستگیری جو اہلِ نظر
تو یہ خاص بچے ہوں مثلِ قمر

یہ ہر گام آگے ہی آگے بڑھیں
دعا ہے یہی خوب پھولیں، پھلیں

پیرو: پیچھے چلنے والا، تقلید کرنے والا۔
پیکر: شکل وصورت۔
دستگیری: مدد۔

سات سال کی جان

دو بھائی پردیس گئے۔ ایک غریب تھا دوسرا امیر۔ دونوں
کے پاس ایک ایک سواری تھی۔ غریب کے پاس گھوڑی اور امیر کے
پاس گاڑی۔ چلتے چلتے رات ہو گئی۔ دونوں ایک جگہ ٹھہر گئے۔
رات کو غریب کی گھوڑی نے بچھیرا دیا۔ بچھیرا لڑھک کر
گاڑی کے نیچے آ گیا۔ سویرا ہوتے ہی امیر بھائی نے اپنے
غریب بھائی کو جگایا اور کہا:
"اٹھو دیکھو میری گاڑی کے رات بچھیرا ہوا ہے۔"
غریب اٹھ گیا اور بولا "بھلا گاڑی کے بھی کہیں بچھیرا ہوتا
ہے۔ یہ تو میری گھوڑی کا معلوم ہوتا ہے۔"
"اگر اس کا ہوتا تو اسی کے پاس ہوتا" امیر بھائی نے کہا۔
دونوں میں جھگڑا ہوا۔ بات کچہری تک پہنچی۔ امیر بھائی نے
ججوں کو رشوت دے کر اپنی طرف کر لیا۔ بے چارے غریب کے پاس
رونے دھونے کے سوا کچھ نہ تھا۔
ہوتے ہوتے معاملہ بادشاہ زار کے پاس پہنچا۔ زار نے دونوں
بھائیوں کو بلایا اور چار پہیلیاں ان سے بوجھوائیں۔ اس نے پوچھا:
"دنیا میں سب سے طاقت ور اور تیز، سب سے موٹی، سب سے
نرم اور سب سے پیاری چیز دنیا میں کون سی ہے؟"

زار نے انہیں سوچنے کے لیے تین دن کی مہلت دی۔
اس نے کہا "چوتھے دن آؤ اور مجھے اپنے جواب بتاؤ۔"
امیر بھائی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اسے اپنی ایک رشتے دار
عورت یاد آئی اور وہ اس سے پوچھنے کے لیے چل پڑا۔
جب وہ عورت کے یہاں پہنچا تو اس نے پیار سے اسے
بٹھایا، خوب آؤ بھگت کی۔ پھر پوچھا "تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"
"زار نے مجھ سے چار پہیلیاں پوچھی ہیں اور تین دن کی
مہلت دی ہے۔" امیر بھائی بولا۔
"اچھا تو بتاؤ کیا پہیلیاں ہیں؟"
"پہلی پہیلی یہ ہے کہ دنیا میں سب سے طاقت ور اور تیز
کون سی چیز ہے؟"
"واہ، یہ تو میرے شوہر کی گھوڑی ہے۔ اس سے زیادہ طاقتور
اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا چابک کا اشارہ ہوا اور وہ ہوا سے
باتیں کرنے لگی۔"
"اچھا دوسری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے موٹی چیز کون
سی ہے؟"
"واہ، یہ تو ہمارا سانڈ ہے۔ وہ اتنا موٹا ہے کہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔"
"تیسری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے نرم چیز کون سی ہے؟"
"واہ، یہ تو میرا پروں والا بستر ہے۔ میں نے خواب میں
بھی اس سے نرم چیز کوئی نہیں دیکھی۔"
"خیر آخری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے پیاری چیز
کون سی ہے؟"
"میرا پوتا ایوانوشکا۔ اس سے بڑھ کر پیارا کون ہو سکتا ہے بھلا۔"
"خدا تمہیں خوش رکھے نیک بی بی۔ میں اب سمجھ گیا کہ
مجھے بادشاہ کو کیا بتانا چاہیے" امیر بھائی نے کہا۔
اب بے چارے غریب بھائی کی سنو۔ وہ روتا ہوا گھر کی
طرف چلا۔ دروازے پر اسے اپنی سات سال کی بچی ملی۔ وہی اس کا
کل خاندان تھا۔ اس سات سال کی بچی نے کہا:
"بابا تم پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہے ہو؟"
"روؤں نہ تو کیا کروں؟ زار نے مجھ سے چار پہیلیاں پوچھی
ہیں اور میں ان کا جواب زندگی بھر نہیں دے سکتا۔"

"مجھے بتاؤ یہ پہیلیاں کیا ہیں؟" زار نے پوچھا۔
"پہلا تو یہ کہ سب سے تیز کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ سب سے موٹی
سب سے نرم اور سب سے پیاری کیا ہے اور سب سے قیمتی کون سی ہے؟"
امیر کے پاس جو گھوڑا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ سب سے طاقت ور اور
تیز ہے۔ سب سے موٹی زمین ہے کیوں کہ جو کچھ بھی
اگتا ہے اور جو چلتا پھرتا ہے، سب کو وہی کھلاتی
پلاتی ہے۔ سب سے نرم ہاتھ ہے کیوں کہ آدمی چاہے جس چیز
پر بھی لیٹے، سر کے نیچے ہمیشہ اپنا ہاتھ رکھتا ہے اور دنیا میں
سب سے پیاری نیند ہے۔"
تب دونوں بھائی زار کے پاس پہنچے۔ زار نے ان کی بات
سنی۔ پھر اس نے غریب سے پوچھا
"یہ جواب تم نے خود سوچے ہیں یا کسی نے تمہیں بتائے ہیں؟"
"حضور، میری ایک بیٹی ہے، سات سال کی۔ اس نے مجھے
یہ جواب بتائے ہیں۔"
بادشاہ نے کہا "اگر تمہاری بیٹی اتنی ہی عقل مند ہے تو یہ
تھوڑا سا ریشم لے جاؤ اور اس سے کہو کہ میرے لیے ایک بڑھیا سا
تولیہ کل صبح تک بن دے۔"
غریب نے ریشم لیا اور پریشان، اداس گھر پہنچا۔
"نئی آفت آئی ہے، میری بیٹی" اس نے کہا "زار کا حکم
ہے کہ تم ریشم سے ریشم کا ایک تولیہ اس کے لیے بن دو۔"
"گھبراؤ مت بابا" بیٹی نے کہا۔ پھر اس نے جھاڑو کی ایک
تیلی توڑ کر اپنے باپ کو دی اور کہا "اسے زار کے پاس لے جاؤ اور
کہو کہ کوئی ایسا کاریگر ڈھونڈ دے جو اس تیلی سے ایک کھڈی بنا
دے۔ اس کھڈی پر میں تولیہ بن دوں گی۔"
غریب آدمی زار کے پاس پہنچا اور اپنی بیٹی کی بات کہہ
سنائی۔ تب زار نے اسے ایک سو پچاس انڈے دیے اور کہا:
"یہ 150 انڈے اپنی لڑکی کو دو اور کہو کہ کل صبح تک ان
میں سے 150 بچے نکل آئیں۔"
بے چارہ گھر آیا اور بیٹی سے کہا "آہ میری بیٹی! ایک بلا
ٹلی تو دوسری آئی" یہ کہہ کر اس نے ساری بات کہہ سنائی۔
"گھبراؤ مت بابا" بیٹی نے کہا "میں ابھی اس کا انتظام کرتی ہوں۔"

بیٹی نے سارے انڈے پکا کر دوپہر اور رات کے کھانے
کے لیے رکھ دیے۔ پھر اس نے باپ سے کہا "زار کے پاس جاؤ اور
اس سے کہو کہ مرغی کے بچوں کے کھانے کے لیے باجرہ چاہیے۔
کھیت جوتا جائے، باجرہ بویا جائے، کاٹا اور صاف کیا جائے۔ سب کچھ
ایک دن کے اندر ہو جائے۔ نہیں تو بچے بھوکوں مر جائیں گے۔"
زار نے غریب آدمی کی پوری بات سنی اور کہا
"اگر تمہاری بیٹی اتنی ہی عقل والی ہے تو اس سے کہو کل
صبح یہاں ایسے آئے کہ نہ پیدل ہو، نہ گھوڑے پر سوار، نہ ساتھ
تحفہ لائے اور نہ خالی ہاتھ آئے۔"
غریب آدمی نے سوچا "یہ کام تو میری بیٹی کے بس کا
نہیں۔ اب تو آفت آئی کہ آئی۔"
لیکن سات سال کی بچی نے کہا "گھبراؤ مت بابا۔ شکاریوں
کے پاس جاؤ اور میرے لیے ایک زندہ خرگوش اور ایک تیتر خرید لاؤ۔"
غریب آدمی ایک شکاری کے پاس گیا اور اس سے ایک
خرگوش اور ایک تیتر خرید لایا۔
دوسرے روز صبح سویرے اس کی بیٹی نے تیتر ہاتھ میں لیا
اور خرگوش کی پیٹھ پر سوار ہو کر محل کی طرف چل پڑی۔
زار اسے محل کے پھاٹک پر ملا۔ لڑکی نے جھک کر سلام کیا
اور کہا "حضور، یہ آپ کے لیے تحفہ ہے" اس نے تیتر اس کی طرف
بڑھایا۔ زار اسے پکڑنے ہی والا تھا کہ وہ پھر سے یہ جا وہ جا۔
"بہت خوب!" زار نے کہا "تم نے ٹھیک ویسے ہی کیا جیسا
میرا حکم تھا۔ اچھا اب یہ بتاؤ میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ غریب
ہے۔ وہ تمہارے کھانے کا کیا بندوبست کرتا ہے؟"
"میرا باپ سوکھی زمین پر مچھلیاں پکڑتا ہے اور میں ان کا
مزے دار سالن پکاتی ہوں۔"
بادشاہ بولا "واہ ری بے وقوف لڑکی! بھلا کہیں خشک زمین
پر بھی مچھلیاں ہوتی ہیں؟ مچھلیاں تو پانی میں رہتی ہیں۔"
"اور آپ تو عقل مند آدمی ہیں، حضور۔ آپ نے کسی گاڑی
کے بچھیرا ہوتا دیکھا ہے؟"
اس پر زار لاجواب ہو گیا اور اس نے بچھیرا غریب آدمی کو
دلوا دیا۔

سوالوں کے صحیح جواب دیجئے اور 450 روپے کی کتابیں لیجئے

ایک سے زائد اور سات سے کم حل موصول ہونے کی صورت میں انعام مساوی مالیت میں دیے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100، 90، 80، 70، 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔

1۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کس پہاڑ پر جاکر رکی تھی؟
2۔ امام الانبیاء کن کا لقب ہے؟
3۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے کتنے برس حکومت کی؟
4۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی اونچائی بتائیں؟
5۔ نیاگرا آبشار کہاں واقع ہے؟
6۔ دنیا کے سب سے بڑے درخت کہاں پائے جاتے ہیں؟
7۔ سورج کا زمین سے فاصلہ کتنا ہے؟
8۔ وادی سون سکیسر کہاں واقع ہے؟
9۔ اسلام آباد کب پاکستان کا دارالحکومت بنا؟
10۔ سب سے زیادہ سنچریاں کس پاکستانی کھلاڑی نے بنائی ہیں؟

جوابات علمی آزمائش اکتوبر 2006ء

1۔ سنسر اور داباد کا۔ 2۔ 4 سال 9 ماہ۔ 3۔ کوالالمپور۔ 4۔ دہلی (بھارت) میں۔ 5۔ افریقہ میں۔ 6۔ تھامس ایڈیسن۔ 7۔ خنزلہ۔ 8۔ اردن کے قریب۔ 9۔ تبت کو۔ 10۔ حنیف محمد۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان 6 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیے جا رہے ہیں۔

☆ پہلا انعام: فوزیہ آصف، گوجرانوالہ
☆ دوسرا انعام: حمزہ شعیب، لاہور
☆ تیسرا انعام: یاسر سعادت، حیدرآباد
☆ چوتھا انعام: حرا احسان، کراچی
☆ پانچواں انعام: عمران احمد، میرپور خاص
☆ چھٹا انعام: ماریہ جاوید چوہدری، وہاڑی

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کیے جارہے ہیں۔

عادل مشعل لاہور۔ علی فیروز ملتان۔ میر رضا راولپنڈی۔ حسن عسکری اوکاڑہ۔ ندرت پروین سرگودھا۔ عاصمہ ممتاز نوشہرہ۔ وسیم صدیقی اٹک۔ کامل علی منظوری لاہور۔ شعیب حسن ملتان۔ ادریس قریشی منڈی بہاؤالدین۔ علی مرتضیٰ بہاولنگر۔ محمد یونس ڈوگر جھنگ۔ سرور ہاشم ترین ایبٹ آباد۔ نذیر حسین شیخوپورہ۔ ملک عادل حنیف لاہور۔ سلمیٰ صدیقی لاہور۔ ثوبیہ عارف لاہور۔ شہباز احمد شرقپور۔ احسن طارق لیہ۔ محبوب علی خان گڑھ۔ زاہد علی بھٹی راولپنڈی۔ جواد احمد ٹیکسلا۔ مدحت علی لالہ موسیٰ۔ آفتاب احمد خان پشاور۔ علیہ ارشد کراچی۔ صائمہ صوفی لاہور۔ شاہدہ سلیم گوجر خان۔ زاہد بٹ گوجرانوالہ۔ سلیم احمد وزیرآباد۔ عدیلہ منور لاہور۔ سیدہ کوثر پروین لیہ۔ حسن ثاقب ساہیوال۔ علینہ اشرف لاہور۔ زبیدہ جلال لاہور۔ ثمن خالد گوجرانوالہ۔ ذکیہ ڈار لاہور۔ ہانیہ جیلانی لاہور۔ مشرف علی حیدرآباد۔ غلام رسول لاہور۔ رمضان علی لاہور۔ سرور صدیقی راولپنڈی۔ فرقان احمد لاہور۔ کاشف بھٹی ملتان۔ توقیر میر ٹیکسلا۔ سلیم جواد حسن ابدال۔ عثمان وزیر واہ کینٹ۔ شاہد طفیل لاہور۔ ساجد حسین ملتان۔ جمیلہ صدیقی بہاولپور۔ عابدہ نصرت کراچی۔ عاصم طور فیصل آباد۔ سید ذیشان حیدر کراچی۔ صفدر بلوچ لاہور۔ عارف شاہ نقی بھکر۔ افضل حیدر بھلوال۔ ممتاز ملک لاہور۔ راشد قریشی میاں چنوں۔ عامر بھٹی لاہور۔ خالد اکبر صدیقی راولپنڈی۔ رقیہ ادریس لاہور۔ امبرین سعید لاہور۔ زین عارف فیصل آباد۔ عبدالاحد ظہیر لاہور۔ عبدالمتین اعجاز لاہور۔ عدیل سلیم کسووال۔ انعام اللہ شیخوپورہ۔ بلال اقبال گوجرانوالہ۔ سمیع اللہ فیروز والہ۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2006ء

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

پتا: ____________

گاجر کا حلوہ، چھوٹے نانا اور.....

آج چھٹی کا دن ہے۔ گھر میں صبح ہی سے بڑی گہما گہمی اور چہل پہل ہے۔ چھٹی کے روز اسی طرح گہما گہمی ہوتی ہے۔ گھر میں سب لوگ جو ہوتے ہیں۔ مگر آج کے دن کی خاص بات گاجر کا حلوہ خاص اہتمام سے بنایا جاتا ہے اور جب بنتا ہے تو کئی گھر۔ پہلے جب مشینیں اتنی عام نہیں تھیں تو پھوپی جان اور رمضان بابا گاجریں چھیل کے کدوکش کرتے تھے۔ امی، چچی، دادی، پھوپھی یا جو بھی موجود ہو ان کی مدد کرتے تھے اور پھر چچی اماں اپنے ہاتھوں سے لذیذ گاجر کا حلوہ تیار کرتی تھیں۔ اس میں بادام اور کھویا بھی ڈالا جاتا اور اتنا اچھا بنتا کہ محلے کے کئی گھروں میں اس کی سوندھی سوندھی خوشبو جا پہنچتی۔ اور پھر یہ حلوہ محلے والوں کے یہاں بھی بڑے خاص اہتمام سے ٹرے میں سجا کے بھیجا جاتا۔

گاجر کا حلوہ یوں تو سب ہی کا پسندیدہ تھا مگر میرے چھوٹے نانا تو اس کے بے حد رسیا تھے۔ انہیں گاجر کا حلوہ اس قدر پسند تھا کہ اگر سامنے ہو تو پھر انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ابھی تو کھانا بھی کھانا باقی ہے۔ پہلے تو اس وہ گاجر کا حلوہ کھاتے ہی پھر لیتے تھے۔

میں بہت چھوٹا سا تھا جب چھوٹے نانا اچانک غائب ہو گئے۔ کہنے کو تو وہ ہندوستان گئے تھے کہ اپنے آبا و اجداد کے گھروں پر جائیں گے جہاں ان کا بچپن بھی گزرا تھا۔ تاج محل کا نظارہ کریں گے، حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی زیارت کریں گے۔ سیر و تفریح کریں گے اور پھر واپس آ جائیں گے مگر ہندوستان جاتے ہی ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پورے بارہ سال گزر گئے تھے اور کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ ہر طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ رشتہ داروں، احباب کو سب ہی کو خطوط لکھے لیکن ان کا آج تک کچھ پتہ نہ چلا۔ اس فکر میں چچی گھل سی گئیں۔ انہیں اپنے چھوٹے نانا کے زندہ ہونے کی امید بھی کم تھی لیکن وہ دعائیں مانگے جاتی تھیں کہ شاید قبول ہو جائیں۔

میرے دادا اور نانا آپس میں سگے بھائی ہیں۔ ہم سب مل کر ایک گھر میں رہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی سی حویلی ہے جس میں دو منزلیں ہیں۔ ایک منزل پر دادا اور دوسری پر نانا اپنے اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ چچی گاجر کا حلوہ بہت شوق سے اور محبت سے بناتی ہیں مگر جب بناتی ہیں تو کئی بار آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں اور بے اختیار ان کی ایک آہ ان کے لبوں سے نکل جاتی ہے۔ اختر چھوٹے نانا کا نام ہے۔ چھوٹے نانا چچی کے سب سے چہیتے اور سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ چچی اماں سے دس بارہ برس چھوٹے تھے۔ اس لیے ان میں دوستی بھی بہت تھی۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد چچی نے ہی انہیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ میں چار پانچ سال کا تھا جب وہ چلے گئے تھے۔ وہ ہم بچوں

سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ہمارے لیے طرح طرح کے چاکلیٹ، ٹافیاں اور بسکٹ لاتے اور ہمارے ساتھ کھیلتے۔ بڑوں میں بڑے اور بچوں میں بچے بن جاتے۔ امی کے ساتھ ان کا رشتہ ماموں کا نہیں بلکہ بھائیوں اور دوست کا تھا۔ ایک دن گھر میں کھانے کی دعوت تھی۔ سب نے نانی سے گاجر کا حلوہ بنانے کی فرمائش کی جو انہوں نے پوری کی۔ "دیکھنا ذرا ذائقہ کیسا بنا ہے؟" نانی نے امی کو حلوہ کھلاتے ہوئے پوچھا۔ "آج اظفر کی بہت یاد آ رہی ہے۔" "ہاں بس اب بالکل تیار ہے۔" امی نے سر ہلا کے جھکتے ہوئے چھوٹے ماما کے ذکر کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

چونکہ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے نانی نے حلوہ فریج میں رکھوا دیا تاکہ اگلے دن صبح محلے میں بھجوا دیں گی۔ صبح ہوئی۔ نانی اماں قرآن پڑھ کے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ رفیق چائے لے کر آیا لیکن گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ "بیگم صاحب۔۔۔ بیگم صاحب۔۔۔ وہ جی۔۔۔ حلوے والی قاب حلوہ نہیں ہے۔" "کیا مطلب؟" نانی ہکا بکا رہ گئیں۔ "کہاں گئی حلوے کی قاب۔" وہ بولیں۔ "بس خالی قاب صحن میں پڑی ہے۔" نانی اماں اٹھتے ہوئے بولیں "دیکھنا نہ لینے دیا تو ہوگا۔" صحن میں تخت پر خالی قاب پڑی تھی۔ "ہائیں" رفیق ہچکیاں چباتے ہوئے بولا "بیگم صاب۔۔۔ مجھے لگتا ہے یہاں کوئی بھوت ہے۔ ان کو میٹھا بہت پسند ہوتا ہے۔ یہ۔۔۔ یہ بھی۔۔۔ ابھی میں آپ کو بلانے گیا تو ایک گلاس یہاں رکھا ہوا تھا اور اب وہ بھی غائب ہے۔" "کیا ماجرا ہے؟" اور بھی سب آوازیں سن کر کمرے سے نکل آئے۔ رفیق نے ساری کہانی سنائی کہ کس طرح سے قاب غائب ہو گئی۔ "ارے بھئی اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" ابو بولے۔ "کسی بچے کی شرارت ہو گی۔" "صاب جی۔۔۔ بچے تو ادھر کوئی نہیں ہے اس وقت۔" رفیق بولا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا "کیوں بابو صاب۔" "ہاں وہ سب اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر۔۔۔" نانی کی لرزتی ہوئی سی آواز گونجی۔ "اگر یہ سب بارہ چودہ سال ادھر ہوا ہوتا تو میں کہتی بھلا اظفر میاں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔" چھوٹے ماما کے ذکر کے ساتھ ہی فضا میں افسردگی سی پھیلنے لگی جو زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ "ارے بس رہنے دو میاں!!" رمضان بابا جو اب خاصے بوڑھے ہو چکے تھے اپنے کوارٹر میں جاتے ہوئے بڑبڑائے۔ "پتہ نہیں کہاں کی ہانک رہے ہو۔" "رکھی کہیں اور ہو گی اور ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو غائب ہونے کی۔" "ارے۔۔۔ یہ کون ہے۔۔۔" یہ چند الفاظ بے سبب حیرت ان کے منہ سے نکلے۔ کوارٹر کے کھلے دروازے سے کوئی اندر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ سب لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسکے ایک ہاتھ میں چمچ اور دوسرے میں گلاس تھا جبکہ سامنے میز پر قاب رکھی ہوئی تھی اور

ان کی بیٹی ہیں ہم سب یہ مزا تھے ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ہار سنگی اور اعلان تو یہ مچا گئے لگے۔ چور۔۔۔۔ دیکھو حلوہ چور۔۔۔ اس نے ڈسٹ ڈالا ہے۔ "حلوہ چور" کا حلف سے بھرا ہوا تھا اس کے پیچھے پر ملائی تھی اور وہ بس کانپ رہا اور بڑا وکھائی دے رہا تھا وہ سامنے دیکھ رہے اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

ہم سب پھر حیرت سے اس حلوہ چور کو دیکھ کر حیران پریشان سے کھڑے تھے کہ یکایک علی کی لرزتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "آپ۔۔۔۔ آپ" یہ کہتے ہوئے وہ لڑکی کی طرف بڑھیں۔ "اظفر۔۔۔۔ اظفر۔۔۔۔ تم میرے اظفر ہو نا۔۔۔۔" ہم سب ہونقوں کی طرح کھڑے تھے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ "تایا نے آگے بڑھ کے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی حلوہ چور نے پلٹ کر آگے بڑھ کر علی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"آپا۔۔۔ آپا۔۔۔" اس کی روتی ہوئی آواز ہم سب کے کانوں سے ٹکرائی۔ ہم سب سن سے کھڑے تھے۔ لگتا تھا زمین نے پیروں کو پکڑ لیا ہے۔ "اظفر۔۔۔۔ میرے بھائی۔۔۔۔ میرے بیٹے۔۔۔۔" علی بے قراری سے روتے ہوئے بار بار اس کی پیشانی اور چہرہ چوم رہی تھیں۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ واقعی وہ چھوٹے تایا ہی تھے۔ یہ سب کچھ ایک خواب کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

پتہ نہیں کتنی دیر علی چھوٹے تایا کو گلے لگائے روتی رہیں۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی میرا اظفر زندہ ہے۔۔۔۔" وہ بار بار کہتیں۔ سب گھر والے ان کے گرد جمع تھے اور اس ڈرامائی ملاقات کو بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر سب باری باری چھوٹے تایا سے ملے گئے۔ رہا نجی تو وہ اپنی جگہ پہ کھڑا یہ سارا تماشہ انتہائی حیرت کے عالم میں دیکھ رہا تھا جب جذباتی لمحے گزر گئے تو سب چھوٹے تایا کو لے کر اندر آ گئے۔ "ہاں تو میاں اب بتاؤ کہ کہاں رہے؟" تایا نے چھوٹے تایا سے وہ سوال کیا جس کا جواب سننے کو ہم سب بے قرار تھے۔ "کیا بتاؤں" چھوٹے تایا بولے۔ وہ اب بھی علی کے پہلو سے لگ لگائے بیٹھے تھے۔ علی نے انہیں ماں بن کے پالا تھا اور ایک ماں ہی کی طرح ان سے محبت کرتی تھیں۔ "یہاں سے تو یہ سوچ کے ہندوستان گیا تھا کہ وہاں گھوم پھر کے مل ملا کے آ جاؤں گا۔ اس قسمت نے ایسا کھیل کھیلا کہ سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ میری بدقسمتی کہ ایک دن دلی میں گھوم پھر رہا تھا کہ پولیس کے ہتھے ناکردہ گناہوں کے جرم میں چڑھ گیا۔ مجھ پہ جاسوسی، دہشت گردی اور نہ جانے کیا کیا الزامات لگائے گئے۔ کن کن ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا پڑی۔" چھوٹے تایا رو رہے تھے اور ان کے ساتھ ہم سب کے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ واقعی چھوٹے تایا بالکل ہی مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئے تھے گال پچک گئے تھے، رنگ جھلس گیا تھا۔ اپنی عمر سے کم از کم دس پندرہ سال بڑے لگ رہے تھے۔ چہرے پہ جابجا لگے ان جانے نشانات ان کے ساتھ گزرے ہوئے ظلم کی داستان سنا رہے تھے۔ "جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میرا کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تو خیر سگالی کے جذبے کے تحت قیدیوں کے تبادلے میں مجھے چھوڑا گیا۔" ہم سب دم سادھے ان کی داستان سن رہے تھے اور علی ان "میرا اظفر۔۔۔۔ میرا اظفر۔" کہتے ہوئے ان کا لاڈ کر رہی تھیں۔ "مگر میاں اظفر" تایا بولے "یہ تمہیں کیا سوجھی۔۔۔۔ یہاں اتنے عرصے بعد گھر آئے ہو۔ بجائے اس کے کہ ہمارے پاس آتے یہ چوروں کی طرح گاجر کا حلوہ کھانے بیٹھ گئے۔" "یہ بھی آپ نے خوب کہا بھائی صاحب" چھوٹے تایا بولے "جب میں آیا تو باہر کا دروازہ کھلا تھا اور پورا گھر سو رہا تھا۔ سوچا تو یہی تھا کہ سرپرائز دوں گا۔ بھوک بہت لگ رہی تھی۔ فرج کھولا تو گاجر کا حلوہ دیکھا۔ بس مجھے اور کیا چاہیے تھا۔"

"نہیں بھئی ایسا لگتا ہے گاجر کے حلوے کی خوشبو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔" تایا نے کہا اور ہم سب ہنس پڑے۔

> یہ دُنیا مقابلے کی دُنیا ہے،
> اگر آپ دوسروں سے آگے نہیں بڑھتے تو
> دوسرے آپ سے آگے بڑھ جائیں گے!
>
> کرنے والے ہمیشہ اپنا کام آج کے دن کرتے ہیں
> اور نہ کرنے والے ہمیشہ اپنا کام کل کے دن!

سید شوکت اعجاز

حیران کن

فرانسیسی گرامر انگریز مصنف

کسی بھی زبان کی گرامر یا ڈکشنری اہل زبان ہی بہتر طور پر لکھ سکتا ہے۔ مگر 1530ء میں پہلی فرانسیسی گرامر لکھنے والا شخص فرانسیسی نہیں بلکہ انگریز تھا۔ جان پال گریو فرانسیسی زبان کا ماہر اور عالم تھا جس نے اس معاملے میں فرانس والوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

خطرہ پل

براعظم افریقہ کے "بم ہاکل" نامی دریا پر ایک عجیب و غریب پل موجود ہے، جو کہ بڑے بڑے تناور درختوں کو کاٹ کر قلیل نما شاخوں پر ٹکا دیا گیا ہے۔ ان تنوں کے درمیان بھی کئی گز کا فاصلہ ہے جو مسافر چھلانگ لگا کر عبور کرتے ہیں اور اس طرح کئی مسافر گر کر طوفانی لہروں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔

پتوں کا جال

جزائر تاہیتی، واقع بحرالکاہل میں مچھیرے پام کے درخت کے پتوں کو بطور جال استعمال میں لاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے پتوں کو جال نما شکل میں لا کر سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جس سے بے شمار مچھلیاں اس میں پھنس جاتی ہیں جنہیں مچھیرے آسانی سے کھینچ لیتے ہیں۔

انوکھی شناخت

برطانیہ میں ایک کتے نے اپنے مالک کی لاش کو پہچان کر گمنام مجرم کی شناخت کروا دی۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک چور گھر میں نقب لگاتا ہوا صاحب خانہ کی فائرنگ سے ہلاک ہو گیا۔ مقامی پولیس اور لوگ اسے شناخت نہ کر سکے۔ آخر کار اسے تابوت میں بند کر کے رکھ دیا گیا تاکہ اس کے وارثوں کا پتا لگایا جا سکے۔ چند دنوں کے بعد ایک کتا نا جانے کہاں سے آ گیا۔ اس نے تابوت کے گرد چکر لگایا اور جونہی اس نے لاش کا چہرہ دیکھا تو وہیں بیٹھ گیا اور تابوت چاٹنے لگا۔ اس طرح اس شخص کو کتے کی معرفت پہچان لیا گیا اور اس کے لواحقین تک رسائی ہو گئی۔

ڈاکٹر جوزف ایک انتہائی صاحب علم، دانشور اور بلند پایہ ماہر آثار قدیمہ تھے۔ عمر کا ایک طویل دور انہوں نے قدیم مصر کے بچے کھچے کھنڈرات اور عراق میں مصری تہذیب کی گمشدہ میراث کی تحقیق میں گزارا۔ وہ مصری اہراموں کی دیواروں پر کندہ تحاریر بآسانی پڑھ لیتے اسی لیے انہیں علم الانسان کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے چند کردہ تحقیقی نکات کو بھی مانا جاتا اور حکومت وقت انہیں اکثر اوقات انعام و اکرام سے نوازتی رہتی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی رہائش شہر سے دور مضافات میں ایک ویران جگہ پر قلعہ نما گھر میں رکھی تھی۔ جہاں وہ اپنے چند وفادار ملازمین کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کی بیوی ایک عرصہ پہلے انتقال کر گئی تھی اس لیے وہ تنہا ایک بیٹے اور ان ملازمین کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ یہ قلعہ نما گھر ایک بہت بڑی اراضی پر تعمیر کیا گیا تھا جس میں زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ گھر سے ملحق ایک بہت بڑی لائبریری اور قیمتی نوادرات سے بھرا ہوا ایک عجائب گھر بھی تھا چونکہ گھر شہر سے دور ایک ویرانے میں تھا اسی لیے لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ بہت ہی کم تھا ویسے بھی ڈاکٹر صاحب تنہائی پسند انسان تھے اور بیشتر وقت گھر میں ہی رہتے یا پھر لائبریری میں مطالعہ کر کے وقت گزارتے۔ اسے وسیع و عریض گھر میں ہر وقت سناٹے سے ہو کا عالم چھایا رہتا اور اسی لیے گھر کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ یہ آسیب زدہ ہے۔

ڈاکٹر جوزف کا بیٹا جانسن آوارہ منش تھا۔ وہ باپ کی کوئی خبرگیری نہ کرتا بلکہ تعلیم کے بہانے شہر میں کالج ہاسٹل میں رہتا اور کبھی کبھار جب روپے پیسوں کی ضرورت ہوتی تو باپ سے ملنے چلا آتا چونکہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی اکلوتی اولاد سے بے پناہ پیار تھا اسی لیے وہ اس کی ہر جائز یا ناجائز خواہش پوری کر دیتے۔ نتیجتاً اس نالائق اور بد چلن بیٹے نے ان کی تمام جمع شدہ پونجی ضائع کر دی اور اب اس محل نما گھر اور عجائب گھر پر اس کی نظر تھی۔ لیکن فی الحال اس خواہش کی تکمیل میں بوڑھا باپ حائل تھا۔ آخرکار جانسن نے ایک سازش تیار کی اور جائیداد کے عوض روپیہ حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک جعل ساز دوست وکیل "کارلو" سے ساز باز کی۔

کارلو بدنام زمانہ وکیل تھا جس کے پاس بے انتہا ناجائز دولت تھی اور وہ ہر وقت اسی جوڑ توڑ میں لگا رہتا کہ اس ناجائز کمائی کو دگنا کیسے کیا جائے اور جیسے ہی جانسن نے اسے اس جگہ کے بارے میں اسے بتایا تو وہ فوراً اس پر قبضے کے تانے بانے بننے لگا۔ جانسن نے جائیداد کے کاغذات چوری چھپے باپ کی خواب گاہ سے چرائے اور کارلو کے پاس رکھوا کر ایک خطیر رقم حاصل کر لی۔

...اس بات سے مشروط تھی کہ وہ چارلس اس رقم کو وہ
...پس لوٹا دے گا اور وہ کاغذات اسے مل جائیں گے۔
...چارلس سے ساری رقم لے کر امریکہ منتقل ہو گیا اور تہیہ کر کے وہ
...اس سے مل کر بھی نہ گیا۔ پھر عرصہ گزرتے ہی کارلو وہ
...کاغذات واپس لینے کے لیے اپنے وکیل اور بہالی کارلا کے ساتھ
...ڈاکٹر کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔

...ڈاکٹر کے گھر کے باہر صدر دروازے کے درمیان ایک لمبی روش تھی جو گزر کر ہی گھر کے مرکزی دروازے تک پہنچا جاتا تھا۔ جس وقت کارلو اپنے وکیل اور محافظوں کے ساتھ پہنچا تو اس وقت بجنے کا عالم تھا اور سورج غروب ہو رہا ...طرف ایک بڑی پُراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں آتی جس سے وحشت اور خوف کا عنصر غالب تھا۔ ایسے میں کارلو نے بڑھتے ہوئے مضبوط دروازے کو کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کے پرانے خادم چارلی نے دروازہ کھولا اور ...دیکھا۔ کارلو بڑی رعونت سے بولا: "ہمیں فوراً ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو۔" "معاف کیجیے وہ تو آج کل صاحب فراش ہیں وہ کسی سے نہیں ملتے۔" چارلی نے جواب دیا۔ "لیکن ہمیں تو ان کے بیٹے چارلس نے بھیجا ہے کہ مطلوبہ رقم میرے باپ سے لے لو" یہ کہتے ہوئے کارلو کے وکیل نے وہ کاغذات چارلی کو دکھائے۔ چارلی وہ کاغذات دیکھ کر چپ چاپ واپس چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی ہے اور وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب خواب گاہ میں انتہائی نقاہت کے عالم میں بستر پر دراز تھے، وہ شدید علیل تھے۔ کارلو نے خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور جلدی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔ "مجھے پانچ لاکھ پاؤنڈ بمعہ سود ایک ہفتے کے اندر اندر چاہئیں ورنہ تمھیں پوری جائداد میرے حوالے کرنا ہو گی اور میں نے اسی شرط پر اتنی بڑی رقم بطور قرض حسنہ تمہارے بیٹے کو دی تھی۔" ڈاکٹر جوزف کارلو کے اس بیان سے صدمے سے دوچار ہو گئے تاہم انھوں نے بڑے اعتماد سے اسے ثبوت دکھانے کے لیے کہا۔ کارلو کے اشارے پر وکیل نے جائداد کے کاغذات ڈاکٹر صاحب کے

دے دو ورنہ۔" ڈاکٹر جوزف تیب کیبنٹ سے دوچار ہو گئے چونکہ رقم اتنی بڑی تھی، رقم کا فوری بندوبست کرنا ان کے بس سے باہر تھا انھوں نے اس سے کچھ عرصے کی مہلت مانگی۔ "ٹھیک ہے، رقم کا بندوبست ایک مہینے میں ہو جانا چاہئے ورنہ آپ کو یہ گھر خالی کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر کارلو اور اس کا وکیل وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر جوزف نے رقم حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بندوبست نہ ہونے کے باعث وہ ہمت ہار گئے۔ ادھر کارلو دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ چند روز میں وہ اتنی بڑی جائیداد کا مالک بن جائے گا۔

مقررہ دن ختم ہوتے ہی کارلو تن تنہا ڈاکٹر صاحب کے گھر جا پہنچا چارلی اور گھر کے ملازمین نے اسے ڈاکٹر صاحب کی بیماری کے واسطے دیئے لیکن وہ ان سب کو نظر انداز کر کے کمال استقلال سے سیدھا خواب گاہ میں جا پہنچا۔ ڈاکٹر انتہائی نحیف و نزار حالت میں بستر پر دراز تھے۔ کارلو ڈاکٹر کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "بڈھے میں نے تمہیں ایک مہینے کی مہلت دی تھی لیکن تم ڈھیٹ بن کر بیٹھے رہے اب نکلو یہاں سے مجھے جلد از جلد اس گھر میں منتقل ہونا ہے اور میں یہاں سے ساری کتابیں اور بت باہر پھنکوا دوں گا، ویسے بھی اس کباڑ خانے کو صاف کرنے میں بھی ایک خطیر رقم کی ضرورت ہو گی۔"

ڈاکٹر جوزف کو اس قدر خراب رویے کی توقع نہ تھی بہرکیف وہ بڑی تکلیف سے بولے "مسٹر کارلو دیکھو علم کی ان کتابوں اور جو بھی دستاویز کی بے توقیری مت کرو۔"

"بھاڑ میں جائے تم اور تمہارا علم مجھے اس سے کیا غرض مجھے تو یہ گھر چاہیے۔" کارلو نے متکبرانہ انداز میں ڈاکٹر کو جھاڑ پلائی۔ اچانک اس کی نظر عقاب کے بت سے مجسمے پر پڑی۔ وہ اٹھا اور بولا "یہ فضول سا پتھر کا مجسمہ تم نے کہاں سے لیا۔ یقیناً کسی کھدائی کے دوران ملا ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے وہ مجسمہ پوری طاقت سے زمین پر پٹخ دیا جس سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ایک دلدوز چیخ مارتے ہوئے کہا "ظالم انسان ۔۔۔ یہ تو نے کیا کیا ہے؟ اس مجسمے نے تمہارا کیا بگاڑا تھا ۔۔۔ تو نے یہ عمل کر کے اپنی بدبختی کو دعوت دی ہے۔" ہا ہا ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ کارلو بڑی کیفیت میں چلایا "یہ گھر اور اس کی ایک ایک چیز میری ہے ۔۔۔ اب تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا" یہ کہتے ہوئے کارلو نے دروازہ زور سے بند کیا اور باہر نکل گیا۔ راہداری میں گھپ اندھیرا تھا کچھ دور دیوار پر ایک شمع روشن تھی۔ جس کی روشنی میں اسے دو سائے نظر آئے۔ کارلو پر اس وقت ایک انجانا سا خوف طاری ہونے لگا تھا جب وہ نزدیک پہنچا تو اسے ڈاکٹر کے ملازم چارلی اور پیٹر وکٹر نظر آئے۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "چلو جا کر بڈھے کو پانی پلاؤ اور جلد از جلد یہ گھر خالی کر دو۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنستا ہوا راہداری سے نکل کر ایک بڑے ہال کمرے میں آ گیا۔ اچانک ہی ہال کمرے کے قمقمے روشن ہو گئے اور چھت پر لگا فانوس تھرتھرانے لگا کارلو نے جونہی نظر اٹھا کر اوپر دیکھا تو فانوس ایک دھماکے سے فرش پر آن گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ شیشے کے کئی ٹکڑے اسے بھی لگے جس سے کارلو کے اوسان خطا ہو گئے۔ دھماکے کی آواز سن کر چارلی اور وکٹر بھاگتے ہوئے آئے۔ انھیں دیکھتے ہی کارلو غرایا "میں جانتا ہوں یہ سب تمہاری کارستانیاں ہیں۔ فکر مت کرو کل تم سب لوگ سڑک پر ٹھوکریں کھا رہے ہو گے۔" کارلو غصے میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا لیکن اندر سے اسے اس بات کا گمان تھا کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے اور شاید اسی لیے ڈاکٹر سے میرے بے دھڑک رویے پر آسیبی طاقتیں میرے لیے رکاوٹ بن رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ گھر سے باہر نکل چکا تھا ایک انجانے خوف کی لہریں اس کے اعصاب پر ڈیرے جما چکی تھیں۔ وہ جلد از جلد اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہتا تھا باہر مکمل اندھیرا تھا لیکن چاند کی چاندنی میں اسے کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا اس نے بھاگنا شروع کر دیا اسے ایسے لگا جیسے اس کے پیچھے بہت سے سائے بھاگتے چلے آ رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے وہ پل پر پہنچ گیا اور دم لینے کے لیے ذرا رکا۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا کہ اچانک فضا میں ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ خوف سے اس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو اسے ایک بڑا عقاب نظر آیا جو اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پر پھیلا رہا تھا۔ یہ عقاب اس مجسمے والے عقاب سے مشابہ تھا جس کو کارلو نے بلاوجہ انتہائی بے دردی سے توڑ دیا تھا۔ کارلو نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے بھاگنے کے لیے

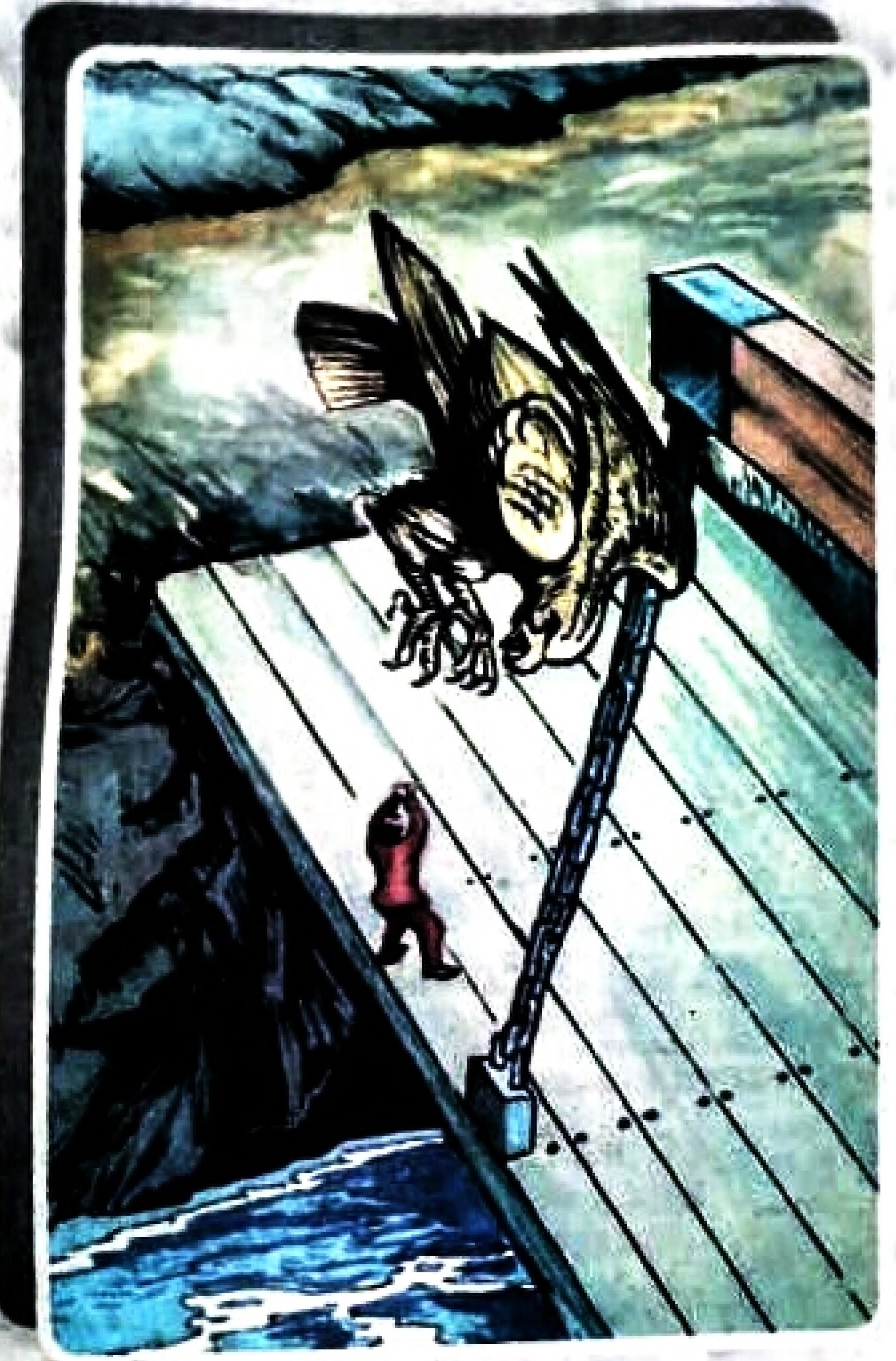

سے نکالی تو اس نے
عقاب نے فضا میں غوطہ
لگا کر کارلو پر حملہ
کیا۔ کارلو نے اپنے
آپ کو اس کے خونخوار
پنجوں سے بچانے کے
لیے پل پر سے ندی میں
چھلانگ لگا دی۔ لیکن بہت
پانی میں غوطہ لگاتے ہی
اس کا جسم سن ہو گیا
سانس لینے کے لیے
جونہی اس نے اپنا سر پانی
سے باہر نکالا تو عقاب
نے اپنے تیز نوکیلے پنجے
اس کے سر پر گاڑ
دیئے۔ کارلو نے اپنے
آپ کو اس کی گرفت
سے نکالنے کی بہت
کوشش کی لیکن عقاب
نے اپنی چونچ اور پنجوں
سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور
کارلو کو اس وقت تک نہ
چھوڑا جب تک اس کی
سانس باقی نہ رہی۔ اور
یوں کارلو کا قصہ تمام
ہوا۔

ادھر مکان میں دونوں ملازم ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچے تو ڈاکٹر نے انتہائی نحیف آواز میں ان سے کہا کہ وہ زمین پر پڑے گملے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اکٹھے کر کے مرتبان میں ڈال دیں۔ ٹکڑے سنبھالتے ہوئے چارلی نے جونہی عقاب کا ٹوٹا ہوا سر زمین سے اٹھایا تو اسے اس کی چونچ پر خون کا تازہ تازہ دھبہ نظر آیا اور سر بھی گیلا لگا جیسے ابھی ابھی پانی سے نکلا ہو۔ چارلی کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "ڈرو نہیں یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا اس نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔" ☆☆☆